آتش کدۂ ایران

اختر کاشمیری

نیو بک ہاؤس اے- پرانی انارکلی لاہور

مندرجات

نام کتاب ـــــــــ آتش کدۂ ایران

مصنف ـــــــــ اختر کاشمیری

سرورق ـــــــــ حضرت عبدالرشید قمر

کتابت ـــــــــ نصیرالدین تلمیذ عبدالرشید قمر

آرٹ ایڈیٹر ـــــــــ عبدالرشید

تصحیح اغلاط ـــــــــ ارشد حسن ثاقب

ناشر ـــــــــ سلیم اعجاز

پرنٹر ـــــــــ انتخاب جدید پریس لاہور

طبع اوّل ـــــــــ فروری ۱۹۸۴ء

ملنے کا پتہ ـــــــــ ندیم بک ہاؤس

۴۱ پُرانی انارکلی لاہور ـــــــــ پاکستان ـ

فون ـــــــــ ۲۱۲۴۴۱

قیمت =/۳۵ روپے

"جو لوگ دوستی کا اظہار
کرتے ہیں درحقیقت وہ دشمنی کرنے
میں مصروف رہتے ہیں اور جو لوگ
اختلافِ رائے کا اظہار کرتے ہیں،
وہی حقیقی دوست ہوتے ہیں، کیونکہ دوستی کا
اظہار کرنے والے اپنے دوست کو اس کے
عیوب سے آگاہ نہیں کرتے، بلکہ اُن کی
پردہ پوشی کو اچھا سمجھتے ہیں، اس کی
وجہ یہ ہے کہ وہ حق کو حق کے لیے
نہیں چاہتے"
حق و باطل — ص ۱۰۷
قولِ خمینی

ایران کا انقلاب تاریخ کا ایک محیّر العقول واقعہ ہے۔ ایک بوریہ نشیں نے ایک شہنشاہ کا تخت الٹ دیا۔ اس لحاظ سے ایرانی عوام کی جد و جہد اور آیت اللہ خمینی اپنے تاریخ ساز کردار کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے، آیتُ اللہ خمینی نے اپنے یادگار کردار و عمل سے اپنے لیے بلند مقام بھی بنایا اور بعض فکری، نظری اور سیاسی حوالوں سے اس مقام کو تاریخ کے صفحات میں محفوظ بھی کرا لیا ہے۔

ان کے برپا کردہ انقلاب پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ روس اور فرانس کے انقلاب کے بعد اہلِ قلم انقلابِ ایران پر جس قدر متوجہ ہوئے کسی اور پر ہرگز متوجہ نہیں ہوئے۔ دُنیا کے اخبارات و جرائد میں انگنت مضامین، لاتعداد تبصرے اور تجزیے چھپنے کے علاوہ اس موضوع پر بعض بڑی وقیع اور علمی کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں، پھر مضامین اور کتابوں کی اشاعت کا یہ سلسلہ کسی ایک مُلک ہی میں نہیں، بلکہ دُنیا کے ہر ملک کے اربابِ علم و سیاست نے اس پر کچھ نہ کچھ لکھا ہے یا لکھ رہے ہیں اور لگتا یوں ہے کہ یہ سلسلہ آئندہ کئی نسلوں تک برابر جاری رہے گا۔

خمینی اگر یہ انقلاب لانے کے بعد کاروبارِ حکومت سے الگ ہو جاتے اور اختیار و اقتدار کو اپنی ذات میں منتقل نہ کرتے تو ان کا مقام تاریخ میں کہیں زیادہ اُونچا ہوتا لیکن بدقسمتی سے وہ اختیار و اقتدار سے اپنے آپ کو الگ نہ رکھ سکے، بلکہ اس کی اعلیٰ ترین مسند پر خُود فائز ہو گئے، اس لیے قدرتاً اس دور میں جو جو اقدامات اور کارروائیاں ہوئیں ان کے وہی ذمہ دار قرار پائے اور اس طرح ان کی شخصیت متنازعہ بن کر رہ گئی، اس کے ساتھ ساتھ

انہوں نے اپنی جماعت کے تمام علماء کو بھی مسندِ علم وارشاد سے تخت و تاج کی منزل تک پہنچا کر تھیوکریسی قائم کر دی۔ جماعتِ علماء کو اس فیلڈ کی ٹریننگ حاصل تھی اور نہ ہی یہ ان کا کام تھا

جس کا کام اُسی کو ساجے

ایران میں بے شمار جدید تعلیم سے آراستہ لوگ موجود تھے اور ان کا سینہ بھی اسلام کے نور سے روشن تھا، اگر اختیار و اقتدار ان لوگوں کے سپرد کر کے علماء حکومت کے مشیر، محتسب اور محاسب بن کر کام کرتے تو صورتِ حال مختلف ہوتی مگر ایسے تمام لوگوں کو ایک ایک کر کے سین سے ہٹا دیا گیا، جنہوں نے خود انقلاب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، بے بہا قربانیاں دی تھیں، مزید براں یہ کہ وہ دینی علوم کے ساتھ ساتھ عالمی سیاسیات اور عصری علوم کے بھی ماہر تھے۔ اس طرح جو لوگ منظر سے ہٹتے رہے، علماء آگے بڑھ کر ان کے منصب و مقام کو خود ہی سنبھالتے چلے گئے۔ حیرت یہ ہے کہ اس دورِ حکومت میں سزا اور تعذیب کا جو طوفان اٹھا وہ علماء کے ہاتھوں اٹھا اور اسے اسلامی انقلاب کی ناگزیر منزل ٹھہرایا گیا۔ یہ اسلامی انقلاب کی نہایت بھونڈی تصویر تھی۔ اسلامی انقلاب کا انداز تو یکسر جُدا ہے۔ اس میں تعذیب پر زور نہیں ہوتا، تہذیب پر غور ہوتا ہے، یہاں تعزیر کو مٹایا جاتا ہے اور تنویر کو اُبھارا جاتا ہے، یہاں جسم و جان کو فتح کرنے کے بجائے رُوح و دل کو مُسخر کیا جاتا ہے۔ ایسے انقلاب کا نمونہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے وقت پیش کیا تھا۔ عفو و درگزر کا یہ نمونہ آپ کے نام لیواؤں کے لیے جب بھی مثال تھا، اب بھی مثال ہے اور رحم و کرم کا یہی نمونہ قیامت تک اہلِ طاقت کو طاقت کے غلط استعمال سے روکتا رہے گا، خمینی اور ان کے پیروکار بھی اگر اس اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرتے تو ایران میں دار و گیر اور کشت و خون کا جو نہ ختم ہونے والا ایک شیطانی چکر چلا، وہ نہ چلتا اور اس طرح اسلامی انقلاب کے بارے

میں دُنیا میں جو غلط تصوّرات اور بد گمانیاں پیدا ہوئیں وہ پیدا نہ ہوتیں، اگر چند قومی مجرموں کو کُھلی عدالتوں کے ذریعے کیفرِ کردار تک پہنچانا ناگزیر تھا تو اسلامی احکامات کی روشنی میں اس کی گنجائش نکالی جاسکتی تھی مگر سینکڑوں افراد کو سرسری سماعت پر موت کے گھاٹ اتارتے چلے جانا کسی صورت میں حسنؓ اور حسینؓ کے نانا کا طریقہ نہیں۔

مغرب میں اس وقت مادیّت کے ردّ عمل میں رُوحانیت کی طرف جو میلان پیدا ہو رہا ہے وہ دعوتِ اسلامی کے نقطۂ نظر سے بڑا حوصلہ افزا ہے۔ اسلام کے مبلّغ اس میلان کو صحیح سمت دے سکتے تھے، کیونکہ اس وقت مغرب میں جو رُوحانی خلاء پیدا ہو چکا ہے اسے صرف اسلام ہی پُر کر سکتا ہے مگر ایران نے اس موقع پر جس اسلامی انقلاب کی طرح ڈالی ہے اس کے بعد عالمِ مغرب میں اسلام کی اشاعت کے دروازے بہت لمبی مدّت کیلئے بند ہو گئے ہیں اور مغرب کے جو نوجوان مادیت سے بھاگ کر رُوحانیت کے دامن میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ انہیں اس طرف آنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں پر ان کی رُوح کی تشنگی محبّت و مروّت سے بُجھانے والا کوئی نہیں، البتہ ان کے رشتۂ حیات کو ختم کرنے والے بے شمار ہیں۔ وہ محبّت کا امرت تلاش کرنے کے لیے نکلے ہیں، ان کے لیے زہر کا پیالہ لیکر آگے بڑھنا اسلامی تعلیمات اور اس کی حکمتوں کے سراسر خلاف ہے۔

یہ انقلاب دنیا کو کوئی روحانی پیغام تو دے نہیں سکا اور جو سیاسی نقشہ اس نے پیش کیا ہے۔ وہ اتنا ناقص ہے کہ بہترین سیاسی نظام رکھنے والی سیاسی قومیں اس کی تقلید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گی، ان قوموں کو اشتعال سے کوئی بات نہیں سمجھائی جاسکتی۔ انہیں صرف اور صرف معقول اور حکیمانہ استدلال سے قائل کیا جاسکتا ہے۔

اس انقلاب میں آیت اللہ خمینی کو جس طرح پرستش کا مرکز بنایا گیا ہے، لگتا ہے کہ انقلابِ

ایران کا یہ سارا تانا بانا ان کے رخصت ہوتے ہی بکھر کر رہ جائے گا، اس سلسلہ میں چار ممکنہ صورتیں رُونما ہوسکتی ہیں۔

۱۔ شہنشاہ کا بیٹا آئینی بادشاہ بن کر واپس آجائے۔

۲۔ علماء حکومت کے تسلسل کو اسی طرح برقرار رکھیں۔

۳۔ ایرانی فوج عراق کے ساتھ مسلسل جنگ اور قربانیوں کے نتیجے میں قوم کی نگاہ میں اپنا کھویا ہوا وقار بحال کرنے کے بعد اقتدار پر قبضہ کرلے اور وہ کسی اعتدال پسند رہنما کو حکومت کی سربراہی سونپ دے۔

۴۔ مُلک کے داخلی انتشار اور ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے ہی خواہوں کے ذریعے مُلک پر روس قابض ہو جائے۔

ان میں سے پہلی دو صُورتیں ناقابلِ عمل ہیں، ایرانی شہنشاہیت کے خلاف اتنی عظیم قربانیاں دینے کے بعد اب ایران یہ رجعتِ قہقری کبھی نہیں کرے گا، علماء حکومت کا تسلسل قائم رکھنے میں اس لیے ناکام ہوں گے کہ ان میں خمینی کے بعد کوئی ایسی قدآور شخصیت نہیں ہے جو مختلف گروپوں کو ایک ساتھ ملا کر نظامِ مملکت چلا سکے۔ اس صورت میں دو متبادل راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک فوج کی حکومت اور دوسرے روسی تسلط — ظاہر ہے ان دونوں صُورتوں میں سے، جو بھی صورت مستقبل کے پیلنے میں محفوظ ہے وہ ایران کے لیے تو بُری ہوگی ہی۔ خود اسلامی انقلاب کے خواب کو بھی خوابِ پریشاں بنا دے گی اور وہ انقلاب، جو ایک انوکھی دھوم اور نرالی دھج سے آیا تھا، اس کا شیرازہ چند ہی برسوں میں بکھر کر رہ جائے گا،

ایران کے انقلاب پر جہاں دُوسرے ملکوں کے اہلِ قلم نے اپنے تبصرے اور تجزیے پیش کیے ہیں، وہاں پاکستان کے کئی اہلِ فکر و نظر نے بھی اس پر بعض قابلِ ذکر تصنیفات

شائع کی ہیں، بہت سے احباب کو انقلابِ ایران کے بعد ایران کی سیاحت کا بھی موقع ملا ہے اور انہوں نے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس کی حقیقی تصویر کشی کرنے کی کوشش کی ہے، جناب اختر کاشمیری بھی انہی اصحابِ فکر و نظر میں شامل ہیں، جنہیں انقلابِ ایران بچشمِ خود دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لیے ان کی یہ کتاب سفر نامہ بھی ہے اور نظر نامہ بھی ۔
کتاب میں پیش کیے جانے والے جملہ نتائج سے تو میں اتفاق نہیں کرسکوں گا۔ البتہ اس کی تین خوبیاں ایسی ہیں، جو اس کا مطالعہ کرتے وقت جگہ جگہ دامنِ دل کو کھینچتی ہیں۔

- یہ کتاب ایک ادبی شہ پارہ ہے، میں نے اختر صاحب کی بہت سی تحریریں پڑھی ہیں، وہ ہمیشہ زوردار اور باوقار انداز میں قلم اٹھاتے ہیں مگر زبان و بیان اور شعر و ادب کی لطافت کے اعتبار سے ان کا قلم اس کتاب میں اپنے شباب پر ہے، انہوں نے اس کتاب کے ذریعے اردو ادب میں ایک حسین اضافہ کیا ہے اور تنہا یہی خوبی اس کتاب کو ہمارے لٹریچر میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔
- یہ کتاب ایک محبِ وطن پاکستانی کے جذبات و تاثرات کا مرقع ہے۔ جگہ جگہ حبِ وطن کا یہ جذبہ انگڑائیاں لیتا نظر آتا ہے، اکثر اہلِ قلم جنہیں ایرانی حکومت نے دعوت دیکر بُلایا ہے، وہ میزبانوں کی رُور رعایت کرنے اور اپنے سفر کی لطافتوں ہی میں کھوئے رہنے سے فارغ نہیں ہوسکے، واپسی پر ان کا قلم قصیدہ خوانی کے سوا کچھ نہیں کرسکا، جیسے یہ بھی حقِ نمک ادا کرنے کا تقاضا ہو، لیکن اختر صاحب ایسی کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئے اور ایک محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے انہیں ایران میں جہاں جہاں بھی پاکستان کے بارے میں کوئی بے خبری یا بد خبری کا پہلو نظر آیا اس پر وہ سراپا احتجاج بن گئے۔

اختر صاحب نے کتاب میں جہاں خمینی، قائدِ اعظمؒ اور دنیا کی دوسری شخصیات پر تقابلی نظر ڈالی ہے، وہاں انہوں نے تحریکِ پاکستان کو بڑے خوبصورت تناظر میں پیش کیا ہے اور ان کی کتاب کا یہ حصہ اُن بڑی بڑی ضخیم کتابوں پر بھاری ہے، جو ہمارے ہاں سرکاری

سرپرستی میں قائم اداروں نے شائع کی ہیں۔

○ یہ کتاب ایک غیرت مند مسلمان کے دل کی پکار ہے۔ ایک ایسا مسلمان جو فرقہ واریت سے بالاتر ہوکر سوچتا ہے اور جو صرف اور صرف اسلام کے درد سے سرشار ہے۔ اس کے سامنے زمانہ حال کی عارضی ہماہمی نہیں، بلکہ وہ مستقبل کے زمانوں کو نظر میں رکھ کر اسلامی انقلاب کی پائیداری پر نظر رکھتا ہے، اس غیرتِ اسلامی نے کہیں کہیں اس کے قلم کو جرّاح کا نشتر بھی بنا دیا ہے۔ وہ پھول بکھیرتے بکھیرتے شعلے بھی اُگلنے لگتا ہے، لیکن یہ سب کچھ اس کے دلِ درمند کی پکار ہے، اس آواز میں کسی علاقائی اور فرقہ وارانہ سیاست کا کوئی جذبہ محرکہ کارفرما نہیں ہے۔

مجھے اُمیّد ہے کہ ان کی یہ کتاب ہمارے ہاں بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی اور اس سے پروپیگنڈے کی طلسم کاریوں میں سے حقیقت کا روئے زیبا دیکھنے میں اہل وطن کو کافی مدد ملے گی۔

کوثر نیازی۔ اسلام آباد

۱۸ ر جنوری ۱۹۸۴ء

شمعِ سخن

انقلاب پر لکھی جانے والی یہ کتاب کچھ ایسی انقلاب آور بھی نہیں کہ اس پر باقاعدہ مُقدمہ قائم کیا جائے، البتہ نفسِ کتاب کے بارے میں دفعِ سوال یا جوابِ جرح کے طور پر اتنا بتا دینا ہی کافی ہوگا کہ گزشتہ برس تہران میں ہونے والی عالمی "سیرت کانفرنس" میں حکومتِ ایران کی دعوت پر شرکت کرنے والے بے شمار علماء میں خاکسار بھی شامل تھا اور یہ کتاب اُسی سفر کے مطالعے و مشاہدے کا نتیجہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اگرچہ چھ ابواب یا چھ مضمون تھے، لیکن ہم نے نصفِ اوّل کی اشاعت کو اولیت دی ہے، کیونکہ اس موضوع پر ہم اپنے پڑھنے والوں کے سامنے اتنے صفحات پیش نہیں کرنا چاہتے، جن کے مطالعے کے لیے انہیں ایک سے زائد نشستوں کا اہتمام کرنا پڑے۔

کتاب کے خاتمے پر مزید مُطالعے کے لیے آپ کا دل بے قرار ہوگا، لیکن فی الحال آپ کو اس سے زیادہ نہیں ملے گا، دراصل ہم پہ اس راز کا دَر، دیر سے باز ہوا کہ طویل کتابیں پڑھنے کے بعد آدمی سکُون چاہتا ہے، جب کہ مُختصر کتابیں حرکت افزا ثابت ہوتی ہیں، اس لیے یہ کتاب پیش کرنے کا مقصد سُلانا نہیں، جگانا اور جگائے رکھنا ہے۔

"بندگیِ بُوتراب" میں مشغول دوستوں کے عقیدے میں آئمہ کی تعداد بارہ ہے، جن میں سے گیارہ ظاہر ہو چکے ہیں اور آخری امام ابھی غائب ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ "امام خمینی" کے پیروکار انہیں کن معنوں میں "امام" کہتے ہیں؟ اللہ جانے یا آیتُ اللہ، کہ انقلابِ ایران کے بعد آئمہ کی تعداد بارہ سے بڑھ گئی ہے یا امام کا معنیٰ بدل گیا ہے؟

ہماری کتاب میں ہر جگہ خمینی سے پہلے "امام" کا لفظ موجود ہے، مگر ہم نے اس لفظ

کو نام کا حصّہ سمجھتے ہوئے استعمال کیا ہے، جیسے حُسین امام، مشیر پیش امام، مُمتاز مُفتی وغیرہ نام ہیں، مگر ان میں سے کوئی ایک فرد بھی دینی معنوں میں امام ہے نہ مُفتی ——— !

چراغ سے روشنی نکلتی ہے اور آگ بھی ——— مگر مقصود روشنی ہوتی ہے، آگ نہیں ہوتی، چراغ کی روشنی سے تاریکی تحلیل ہو جاتی ہے، بلاشُبہ یہ مُثبت انقلاب ہے، البتّہ چراغ جلایا روشنی کے لیے اور لگ گئی آگ تو یہ انقلاب بہرحال منفی کہلائے گا۔ اس صُورت میں اس کی روشنی پر دلائل تراشنے کے بجائے اس سے بھڑک اُٹھنے والی آگ کو ٹھنڈا کرنا لازم ہوگا، دُور سے دیکھنے والے اگرچہ اس کی روشنی سے متأثر ہوتے ہیں، مگر اس میں جلنے والوں کے لیے اس کی روشنی بے کار ہے، ایسی روشنی تو نارِ نمرُود میں بھی تھی، لیکن نارِ نمرُود اور شعلۂ طُور کی روشنی میں بہرحال فرق ہے۔

انقلابِ ایران کی مثال بھی چراغ کی سی ہے، کچھ لوگوں نے اُسے دُور سے دیکھا تو انہیں صرف نور کا ہالہ نظر آیا، مگر ہم نے اس کی تپش کو بہت قریب سے محسوس کیا ہے، اس لیے ہمارے نزدیک وہ نور کا ہالہ نہیں، شعلۂ جوّالہ ہے۔

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے
خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے
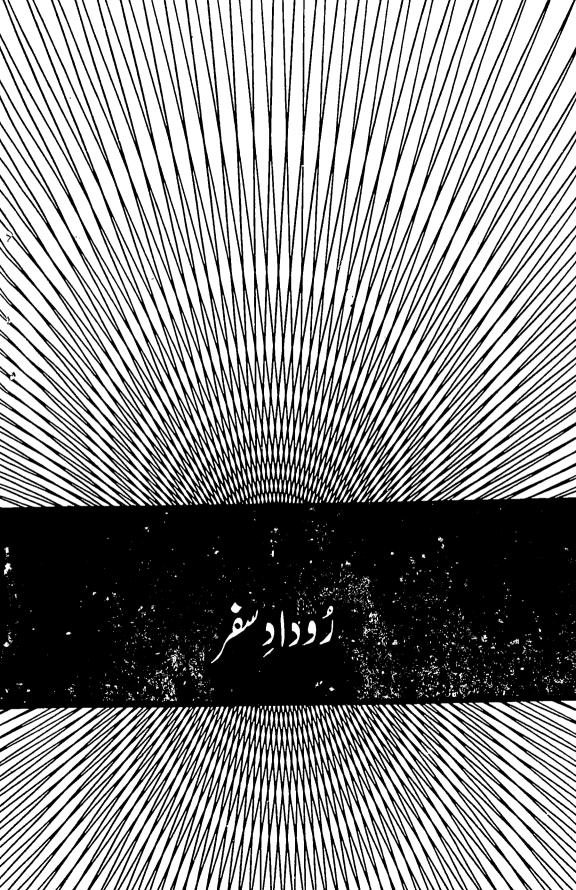
اختر کاشمیری

لندن ۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء

رُودادِ سفر

کہتے ہیں سفر وسیلۂ ظفر ہوتا ہے، لیکن میرا سفرِ ایران "فکرِ فردا" ثابت ہوا۔ اربابِ دانش کے نزدیک فردِ بینا کے لئے فکرِ فردا ذکرِ امروز سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اسی لئے رُوداد سفر کا اجمالی اور نتائجِ سفر کا تفصیلی تذکرہ سپردِ قلم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ممکن ہے اس اجمال میں جمال اور تفصیل میں فصیل نہ ہو مگر اس کے باوجود شاہد کا مشاہدہ غائب کے تصور سے زیادہ موزوں ہوگا، بات پُرانی سہی نئے دور میں بھی کہی جاسکتی ہے

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

ایران بلاشبہ زمین انقلاب ہے۔ ۔۔۔ اس کے ذرّوں میں بھی انقلاب ہے اور ستاروں میں بھی انقلاب، اس کے گلوں میں بھی انقلاب ہے، اور گلزاروں میں بھی انقلاب اس کے چمن میں بھی انقلاب ہے اور سرو سمن میں بھی انقلاب، اس کے پھولوں میں بھی انقلاب ہے اور کلیوں میں بھی انقلاب، اس کی ہوا میں بھی انقلاب ہے اور مردانِ باصفا میں بھی انقلاب، اس کی فضا میں بھی انقلاب ہے اور عندلیبانِ خوش نوا میں بھی انقلاب۔۔۔ مختصر یہ کہ اس زمین کو جس جہت، جس سمت اور جس پہلو سے دیکھیں، ہر گا اور ہر مقام پہ نقشِ انقلاب نظر آئے گا، بہ زبانِ حضرتِ غالب

گلشن میں بند و بست بہ رنگِ دگر ہے آج

قُمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

طویل بات کو قلیل الفاظ میں یوں بھی ادا کیا جاسکتا ہے کہ ایران کا حاضر رقبہ انقلابِ جدید کے قد و قامت سے کم ہے، رقبے کا عرض دلِ عاشق کی طرح مختصر ہے اور انقلاب کا طُول شبِ فراق کی مانند دراز۔۔۔ انقلاب کو پھیلائیں تو زمین گُم ہو جاتی ہے، زمین کو

وسعت دیں تو انقلاب تحلیل ہو جاتا ہے، اس مشکل کا یہ انقلابی حل نکالا گیا کہ زمینِ انقلاب کو بڑھانے کے لئے حرب و ضرب کا عمل جاری کیا جائے اور "انقلاب اسلامی" کو پھیلانے کے لئے عالم اسلام کے مجموعی رقبے کو تصرف میں لانے کی کوشش کی جائے، بنا بریں کشورِ ایران کے پیر و جواں ان دنوں فلسفۂ انقلاب کی جو تشریح و توضیح کرتے ہیں اس کا مفہوم کلامِ اقبال میں اس طرح مرقوم ہے

ہر مُلک ملکِ ماست کہ مُلک خدائے ماست

ایران کے شرعی دانشوروں کا خیال ہے کہ اگر یہ انقلاب دوسرے مسلم ممالک کو ایکسپورٹ کر دیا جائے تو اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ اندرونِ ملک حبس میں غیر معمولی کمی واقع ہوگی اور دوسرا نفع یہ کہ انقلاب نو جہاں تک جائے گا وہاں تک ایران کی دینی و سیاسی بالادستی کے علم گڑ جائیں گے، اہلِ انقلاب کی یہی سوچ ہیرے لئے "فکرِ فردا" ہے اور میرا تاثر یہ ہے کہ "ہفتۂ وحدت" میں شرکت کے لئے جس کو بھی دعوت دی گئی، اِس دعوت کے پس منظر میں یہی انقلابی سوچ کارفرما تھی، یہ الگ بات ہے کہ یہ راز اُس وقت تک راز ہی رہا جب تک ہم زمینِ انقلاب میں داخل نہیں ہوئے اور میں آغازِ کلام ہی میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ "اسلامی انقلاب" ایکسپورٹ کرنا کوئی جرم نہیں۔ البتہ طریقِ کار میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے ؎

ہزار ہم منظری ہو ہزار ہم سُخنی
معاملات من و تُو نکل ہی آتے ہیں

ایک اخبار نویس کی حیثیت سے مجھے ایران کے انقلاب، اس کے مد و جزر اور متعلقہ خبروں کے ساتھ ہمیشہ دلچسپی رہی ہے لیکن ۲۹ نومبر ۸۲ء کو جب امام خمینی کے جانشین امام منتظری کی طرف سے ایران کے دارالحکومت تہران میں ہونے والی "عالمی سیرت کانفرنس" اور "ہفتۂ وحدت" میں شرکت کی دعوت ملی تو انقلاب ایران کے مطالعے و مشاہدے

کی سبیل بھی نکل آئی، انقلاب اور زمینِ انقلاب کو دیکھنے کا خیال اتنا خوشگوار تھا کہ دل پھولوں بھرے باغ کی طرح کِھل گیا، خوشی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ دعوت مجھے خطیب جمعہ کے طور پر دی گئی تھی، یہ چیز دلیل تھی اس بات کی کہ علماء کی حکومت علما کی پذیرائی میں مصروف ہے، دِل نے کہا اتنی بے تابی کی کیا ضرورت ؟

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا

سیرت کانفرنس اور ہفتہ وحدت کی جو تاریخیں دعوت نامے میں درج تھیں ان کے مطابق ۲۶ دسمبر کو ہماری لاہور سے روانگی کی نوبت آتی، درمیانی عرصے میں کچھ ایسی مصروفیات نکل آئیں کہ ایران جانے کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا "ہفتہ وحدت" تو خیر ایک ہفتہ تھا۔ سیرت کانفرنس میں شرکت کی اہمیت بھی ذہن میں کچھ زیادہ راسخ نہ ہو سکی، میں ابھی جانے یا نہ جانے کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ "خانہ فرہنگ ایران" سے حکم صادر ہوا ۲۳ دسمبر تاریخ سفر ہے، میں نے جلدی سے دستِ قسمت پہ نظر ڈالی تو معلوم ہوا

لکیر میرے سفر کی ہنوز غائب ہے

اس موقع پر مجھے خیال آیا کہ اگر "جنگ" کے لئے امام خمینی کا انٹرویو کر سکوں تو سفرِ ایران کا معقول جواز ہے، بصورت دیگر معذرت کر دی جائے، جب میں نے جناب ہادی تقوی کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے وزارت داخلہ کے ایک ذمہ دار رکن جناب مرتضٰی سرمدی کو ٹیلیگرام بھیجا کہ وہ امام خمینی سے میرے لئے ملاقات اور انٹرویو کا موقع فراہم کریں، یہ وعدہ نہیں تھا، کوشش تھی مگر اس میں اتنی کشش ضرور تھی کہ میں عازم سفر ہوتا، عزم کے بعد توکل کی منزل آتی ہے، اس منزل سے گزرتے وقت خدا یاد آتا ہے۔ سو آیا لیکن منزلِ ایران کے تصور نے فیض احمد فیض کی یاد بھی تازہ کر دی

ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے

شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور کے علماء اہل سنّت میں سے بادشاہی مسجد کے خطیب مولانا سید محمد عبد القادر آزاد کے علاوہ صاحبزادہ سعید الرحمٰن احمد بھی مدعو تھے، میں اور صاحبزادہ صاحب جمعرات ۲۳ دسمبر کو ۲ بجے کی فلائٹ پر لاہور سے کوئٹہ روانہ ہوئے، گوجرانوالہ کے اہل حدیث عالم مولانا بشیر الرحمٰن مستحسن بھی ہمارے شریک سفر تھے، علماء اہل سنت کے اس گروپ کے ہمراہ علماء شیعہ میں سے لاہور کے مولانا ابو الحسن علی نقوی، سید عاشق علی نقوی، مولانا احمد علی، مولانا حسین علی نجفی، منڈی کاموںکی سے مولانا حافظ محمد اور منڈی بہاؤالدین کے صابر حسین نقوی بھی تھے۔

ساڑھے تین بجے کے لگ بھگ کوئٹہ ایئرپورٹ پر پہنچے تو چاروں طرف پھیلے ہوئے برف پوش پہاڑوں کے باوجود موسم خوشگوار پایا، اسی خوشگوار موسم میں راولپنڈی کے مخدوم زادہ قاضی محمد اسرار الحق حقانی بھی دریافت ہوئے اور کچھ دوسرے علماء بھی اسی کارواں میں شامل ہو گئے، مخدوم زادہ اسرار الحق عمرِ مسنون کے مالک ہیں لیکن گل رخوں میں جاتے وقت حنا بندی کا پورا پورا اہتمام کرتے ہیں، حضرت موصوف ہماری نظر میں اتنی جلدی نہ آتے اگر کوئٹہ ائیرپورٹ پر غلطی سے اپنے ہلکے بکس کے بجائے کسی ہمسفر کا بھاری اٹیچی کیس نہ اٹھا لیتے، اس لطیفے سے وہ ہماری نظر میں ایسے آئے کہ پورے سفر میں اوجھل نہ ہو سکے، ہماری نظر کرم کے جواب میں وہ بھی نظر کرم کرتے رہے، جب ایران میں ہماری جیب کا آخری "تمان" بھی ایرانی دوکانداروں کی تجوری میں منتقل ہو گیا تو مخدوم زادہ اسرار الحق کی پُر اسرار جیب ہی ہمارا سہارا بنی، کوئٹہ پہنچ کر معلوم ہوا کہ دو ایرانی طالب علم بھی گائیڈ

کے طور پر ہمارے ساتھ ہیں، ان نوجوانوں کے نام تو مجھے یاد نہیں رہے، تھے بڑے بھلے مانس، ایرانی بلوچستان کے پہلے شہر" میر جاوا" تک وہ ہمارے ساتھ رہے، جب میر جاوا میں ایرانی محکمہ اطلاعات کے افسرانِ اعلیٰ نے ہمیں اپنی تحویل میں لے لیا تو یہ دونوں نوجوان غائب ہو گئے، بعد ازاں ایک کو زاہدان ایئر پورٹ پر اور مشہد میں دیکھا جب کو دوسرے کو واپس آتے ہوئے طیارے میں موجود پایا۔

میر جاوا ایرانی بلوچستان کا کوئٹہ ہے، لیکن دونوں میں وہی فرق ہے جو پنبہ و آتش، شعلہ و شبنم اور بہار و خزاں میں ہوتا ہے، کوئٹہ اپنی شانِ انا البرق میں یکتا ہے تو میر جاوا اپنی خاکساری میں منفرد، کوئٹے کے چہرے پر حسنِ لیلیٰ ہے تو میر جاوا کے یمین و یسار میں خاکِ مجنوں، طوفانی ہواؤں کے جھکڑ، آندھیوں کے تھپیڑے اور صحراؤں کے بگولے، ہم سروں سے خاک اڑاتے ہوئے جامہ تلاشی دینے اور پاسپورٹ چیک کرانے کے لئے آگے بڑھے تو پیچھے سے شور اٹھا، پہلے ڈاکٹری معائنہ کرائیے، پھر جایئے، لیکن ہمارے برق رفتار دوستوں نے پلٹ کر دیکھے بغیر فیصلہ سنا دیا، ہماری صحت ٹھیک ہے، کپڑوں کی درستی، چہروں کی جھاڑ پونچھ، نماز کی ادائیگی، پاسپورٹ کی چیکنگ، سامان کی تلاشی اور جاموں کی ہاتھ پھیرائی میں کل ایک گھنٹہ صرف ہوا، اپنی پھرتی اور پاسداروں کی چستی دونوں قابلِ تحسین تھیں، جامہ تلاشی کے دوران پاسدارانِ اسلامی انقلاب کی انگلیاں جسم کے انقلابی حصوں کو بھی چھوتی ہوئی گذر گئیں، ہم نے سوچا عجلت کا کرشمہ ہوگا، لیکن اس سے آگے جو مقامات آئے، وہاں آہ و فغاں بھی سمٹ کر رہ گئی، تب جانا کہ جس چیز کو ہم عجلت کا کرشمہ سمجھتے تھے وہ احتیاط کا تقاضا ہے، رفتہ رفتہ جبا و قبا والے دوست بھی اس مشقِ ناز کے عادی ہو گئے، شاید اس خیال سے کہ محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے، ہمارے ایک ذاکر دوست جو اس طرح تفتیش کو "حفاظتی فرض" کا نام دیتے تھے، ایک موقع پر جب رضاکارانہ طور پر ہاتھ اٹھانے

اور ٹانگیں پھیلائے تلاشی دینے کے لئے کھڑے تھے تو میں نے انہیں ٹوکا ـــ وہ ہنس کر کہنے لگے

تجھے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

ایک اور دوست بولے

تلاشی سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی جسم کے امتحاں اور بھی ہیں

میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اگر اقبال زندہ ہوتے تو تم میں سے ہر مومن کو مخاطب کر کے کہتے

ترا اسے کاش کہ مادر نہ زادے

میر جاوا میں ہمارے استقبال کے لئے محکمہ اطلاعات کے ڈائریکٹر جناب علی حسین میر اور ان کے رفقاء موجود تھے، چھوٹے افسروں نے ہمیں کمرے میں بٹھایا، کھانا لگایا، لائٹنگ کی، کیمرے فٹ کئے اور سب سے آخر میں علی حسین میر بارات کا دولہا بن کر نمودار ہوئے، پاراچنار کے شیعہ عالم عارف حسین شاہ نے شرکاء وفد کا تعارف کرایا، تعارف اور علیک سلیک کے بعد میر صاحب نے تقریر کی جو زلفِ یار کی طرح خم بہ خم اور شبِ ہجراں کی مانند دراز تھی۔ مہمان اپنے میزبان کی تقریر اس وقت تک سنتے رہے، جب تک فقہ جعفریہ کے مطابق نمازِ مغرب کا وقت نہیں ہو گیا۔

نمازِ مغرب کے بعد ہم کاروں میں سوار ہو کر زاہدان روانہ ہوئے تو ایک ڈیڑھ میل کے فاصلے پر پاسداروں کی طاقت کا مظاہرہ دیکھا، کاریں پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھیں کہ ایک چوراہے پر چند مسلح نوجوان نمودار ہوئے، ان کا اشارہ پاتے ہی ہمارے محافظوں نے گاڑیاں روک دیں، پاسداروں نے ان کے کارڈ چیک کئے، ہمارے بارے میں سوال و جواب ہوئے اور جب انہیں پورا اطمینان ہو گیا تو گاڑیاں آگے بڑھانے کی اجازت ملی۔

ہمارے ہم سفر افسروں نے وضاحت پیش کی کہ نماز مغرب کے بعد پیدل اور سوار سبھی لوگ تلاشی دیکر گزرتے ہیں، ہنگامی حالت کا یہ نقشہ دیکھا تو دل دہل گیا، ہم ابھی اسی موضوع پر باتیں کر رہے تھے کہ ایک چیک پوسٹ آگئی، گاڑی رکی تو ایک خوبرو نوجوان نے ہمارے چہروں کا مطالعہ شروع کر دیا، ہمارے چہرے اگرچہ "کتابِ پاک" تھے لیکن ایرانی نظر کو پڑھنے میں مشکل پیش آئی، وقت کا خیال کرتے ہوئے افسر ساتھیوں نے ہم وطن نوجوان کو بتایا کہ یہ سب پاکستانی علماء ہیں جو ہماری حکومت کی دعوت پر آئے ہیں، اس دوران صاحبزادہ سعید نے سر گاڑی سے باہر نکالا تو نوجوان نے جھٹ سے ان کے خطِ راست پہ اپنے ہونٹ ثبت کر دیئے، اب میں سمجھا کہ عجمی ایران کا انداز ملاقاتِ عربی ہے اور اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی میں نے نوجوان کا چہرہ اپنی طرف موڑ کر جوابی کارروائی کر دی، محبت کا یہ بوسہ تمام رفقاءِ سفر کی طرف سے فرضِ کفایہ بن گیا اور نوجوان نے مزید پڑتال کئے بغیر لائن کلیئر کر دی۔

ایران کے لوگوں کو قسّامِ ازل نے جذبۂ مروّت و وفا بڑی فیاضی سے عطا فرمایا ہے ان کے ملنے میں بے ساختگی ہوتی ہے، تصنع یا بناوٹ نہیں ہوتی، وہ جس سے ملتے ہیں خلوص وچاہت سے ملتے ہیں اور جس سے کٹتے ہیں کھلم کھلا کٹتے ہیں محبت و نفرت کے یہ مظاہر ان کے ہاں بہت واضح ہیں، ان کا حسنِ اخلاق اور جذبہ خدمت و ایثار انتہائی قابل ستائش ہے۔

ایران کے تشنہ دہن نوجوانوں کے لئے محبت کا امرت آبِ حیات ہے، وہ ہر اس شخص کو اپنا سمجھتے ہیں جو ان کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آتا ہے، خاص طور پر علماء کی تو ان کے دلوں میں بے حد قدر ہے، چنانچہ زاہدان جاتے ہوئے جو تجربہ ہوا۔ پورے سفر ایران کے دوران ہم نے اسے حربے کے طور پر استعمال کیا جہاں کہیں کوئی پاسدار انتظامی طور پر راستے میں حائل ہوا، ہم نے اس کی تعریف کی، سر

پر ہاتھ پھیرا، پیشانی پر بوسہ دیا، "قربانم شما" اور "بفرمائید" کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

میر جاوا سے زاہدان تک پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی، ڈیڑھ گھنٹے کا سفر لمحوں میں گزر گیا، میں نے اور صاحبزادہ سعید نے زاہدان کے "خاور" ہوٹل میں رات بسر کی جب کہ دوسرے رفقاء نے "مہمان پذیر" ہوٹل میں قیام کیا، ۲۵ دسمبر کی صبح نماز فجر ادا کرنے کے بعد ہم ناشتے کی میز پر جانے ہی والے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، کوئی صاحب بڑی شستہ اردو میں کہہ رہے تھے ___ "آپ نیچے تشریف لا رہے ہیں یا ہم آپ سے ملنے کے لئے اوپر آجائیں؟ میں اور صاحبزادہ سعید خود ہی ان کی پیشوائی کے لئے استقبالیہ میں پہنچ گئے۔

یہ جناب فاضل تھے، ارشاد اسلامی، شعبہ اردو کے سربراہ اور ہفت روزہ ارشاد کے ایڈیٹر، ان کا تعلق پنجاب کے ڈیرہ غازی خان سے ہے، مسلکاً شیعہ ہیں اور بہ سلسلہ ملازمت ایران ہی میں اقامت پذیر ہیں، ان کے ساتھ ہماری بہت سی باتیں ہوئیں لیکن ہم نے ہر بات کا سوچ سوچ کر، رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر اور اٹک اٹک کر جواب دیا، جناب فاضل عالم بھی ہیں اور فاضل بھی، وہ بولتے کم اور سنتے زیادہ ہیں اور سنتے وقت ان کے کان ہی نہیں آنکھیں بھی آمادۂ سماعت ہوتی ہیں، وہ ذہنی طور پر ایران ہی کو اپنا وطن سمجھتے ہیں، انتہائی تیز، چست، ڈپلومیٹ اور پھرتیلے فاضل اسم بامسمیٰ!

سفر ایران میرا پہلا غیر ملکی سفر تھا اور زاہدان کے خاور ہوٹل میں گزرنے والی ۲۴ - ۲۵ دسمبر کی درمیانی رات پاکستان سے باہر گزرنے والی پہلی رات تھی، امشب میرے دل میں ایک نیا احساس بیدار ہوا، ایسا احساس جس سے دل پہلی بار آشنا ہوا، یہ جذبہ یا احساس بہت عجیب اور قوی تھا، اس کی کیفیت یہ تھی کہ میرا دل یہ ماننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا تھا کہ میں پاکستان کا ایک عام شہری ہوں، میرا وجدان

کہتا تھا۔ تم پاکستانی نہیں، خود پاکستان ہو، یہاں تمہارا مطالعۂ ذات پاکستان کا مطالعہ ہوگا، تمہاری ہر خوبی پاکستان کی خوبی سمجھی جائے گی اور ہر خامی پاکستان کی خامی کہلائیگی یہ جذبہ تھا کہ دم بدم بڑھتا جا رہا تھا" یہ جان کر میں بہت حیران ہوا کہ حب وطن کا جذبہ ماں باپ اور اولاد کی محبت پر بھی حاوی ہوتا ہے، اس روز میں نے سوچا اور بہت دیر تک سوچا کہ وہ لوگ کتنے بدنصیب ہیں جو غیر ممالک میں بیٹھ کر اپنے ملک کے خلاف تخریب کاری کی تربیت حاصل کرتے ہیں! کیا ان لوگوں کے پہلو میں دل یا دل میں ایمان نہیں ہوتا؟ میرے اپنے ہی اندر سے آواز آئی! ہرگز نہیں، قطعاً نہیں، بالکل نہیں!!

محترم فاضل نے ہمیں امروزہ پروگرام بتایا جس کے مطابق پہلے ایک دینی ادارے میں جانا تھا اور پھر "لنچ" کے بعد ایک بجے ایئرپورٹ پہنچنا تھا تاکہ تہران جاسکیں، طے شدہ پروگرام کے مطابق آغا مؤیدی کے مدرسہ علمیہ پہنچے، وہ مہمان علما کو انتظار کرانے کے بعد مجلس میں تشریف لائے اور پھر مہمانوں کے اٹھنے سے پہلے ہی چلے گئے، اس تقریب میں آغا مؤیدی نے تقریر کی۔ در اصل مہمان علماء کو ان کی تقریر سنانے کے لئے ہی اس تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن رسم نبھانے کے لئے کہا گیا کہ اگر کوئی پاکستانی عالم چاہیں تو وہ بھی اظہار خیال کر سکتے ہیں، "اگر" کی اس قید نے اگرچہ لب کشائی کا جواز ہی ختم کر دیا تھا لیکن جب منہ سے نکلی بات کو ٹھکانے لگانے کے لئے مصنوعی اصرار ہوا تو قرعۂ فال میرے نام نکل آیا۔

میں نے آغا مؤیدی کے جذبات (جو اگرچہ سرد تھے) کی تعریف کے علاوہ حکومت ایران کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے ہمیں اپنے ملک میں بلایا اور اظہار خیال کا موقع دیا انقلاب ایران کے بارے میں، میں نے صرف یہی کہنے پر اکتفا کیا کہ ایران کے موجودہ انقلاب پر ہمیں کوئی تعجب یا حیرت نہیں ہے، کیونکہ یہ انقلاب ایک تاریخی عمل ہے

اور تاریخی عمل کا نتیجہ ہے، آغازِ اسلام میں ایران مسلمانوں کی فتوحات کا اولیں باب بنا تھا اور اب اس صدی کے آغاز میں احیاء اسلام کی تحریک بھی یہیں سے اٹھ رہی ہے، اگر یہ سچ ہے کہ موجودہ انقلاب اپنے نتائج و عواقب کے حوالے سے اسلامی انقلاب ہے تو سمجھ لیجئے کہ تاریخ نے اپنے آپ کو دھرایا ہے، آج اس تحریک میں جو لوگ جس حیثیت میں کام کریں گے، وہ تاریخ کا حصہ ہوں گے، مستقبل کے امین ہوں گے، آنیوالی نسلیں ان کے کردار و عمل کو مشعلِ راہ بنائیں گی، جہاں تک اس انقلاب کو ایکسپورٹ کرنے کا تعلق ہے تو میرا خیال ہے اِس زحمت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی کیونکہ مُسلم دُنیا میں پہلے ہی سے اسلامی انقلاب کی لہر موجود ہے اس لہر کو بڑھایا تو جا سکتا ہے لیکن روکا نہیں جا سکتا اور یہ حقیقت لوگوں کے ذہن میں ابھی تازہ ہو گی کہ ایران کے انقلاب سے پہلے پاکستانی عوام نے اسی انقلاب کے لئے قربانیاں دی تھیں، جس کے نتیجے میں ہماری قوم کو ایک راہِ عمل ملی ہے اور اس راہ پر ہماری پیشرفت جاری ہے۔

میری گفتگو کے بعد ارشاد ہوا کہ کوئی شیعہ عالم بھی اظہار خیال کریں، شیعہ علماء نے بھی سنیوں کی تقلید کرتے ہوئے متفقہ طور پر اپنی طرف سے صابر حسین نقوی کا نام پیش کیا، جناب صابر حسین نقوی نے ذمہ دارانہ گفتگو کے ضمن میں پاکستان کے حوالے سے ایک دو غیر ذمہ دارانہ باتیں بھی کر دیں چونکہ وہاں ریڈیو اور ٹی وی کا عملہ بھی موجود تھا اور ان ذرائع ابلاغ سے یہ باتیں دُور دُور تک پہنچنی تھیں، اس لئے میں نے جناب فاضل سے استدعا کی کہ ہمارے معزز دوست کی گفتگو کا یہ حصہ ریکارڈ سے حذف کرا دیا جاتے، انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا اور یقین دہانی کرائی کہ ایسا ہی ہو گا، جناب صابر حسین نقوی ذاکر ہیں اور ذاکر کی ان باتوں کا ذکر مناسب نہیں، تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اصولی طور پر ان کی باتیں درست تھیں مگر موقع و محل کے اعتبار سے ان کا اظہار مناسب نہیں تھا، اس لئے ہمارے ساتھ موجود شیعہ علمائے نے بھی انہیں پسند نہیں کیا۔

ہمارے وفد میں شیعہ علمار کی اکثریت تھی اور میں اسے حسنِ اتفاق ہی کہوں گا کہ ان میں بیشتر علماء غیر متعصب تھے، دوران سفر وہ دوستوں کے لئے ایثار و قربانی کا مظاہرہ بھی کرتے رہے، لاہور کے مولانا ابوالحسن اور پارا چنار کے علی مدد، محبت، خلوص اور رواداری میں سب سے نمایاں تھے، پارا چنار کے عارف حسین شاہ نے راستے میں اپنے جسم کے ساتھ ساتھ علمی مقام کو بھی اوورکوٹ میں چھپائے رکھا، ان کا یہ حلیہ پیشہ ور درویشوں سے زیادہ مشابہ تھا، ہم نے بھی ان پر کوئی توجہ نہ دی، کوئٹہ سے تفتان جانے کے لئے ویگن میں سوار ہوئے تو فرنٹ سیٹ پر ہمارے ساتھ بیٹھنے لگے، ہمیں ان کی خاموشی سے تو ڈر لگتا تھا اس کے باوجود سمٹ گئے تاکہ ان کے لئے جگہ بن سکے لیکن ہماری کشادہ قلبی کام نہ آئی سیٹ نے ان کا چودہ کلو کا اوورکوٹ قبول کرنے سے انکار کر دیا ایک ہی وقت میں ادھوری سیٹ پر ان کا کوٹ رکھا جا سکتا تھا یا خود بیٹھ سکتے تھے، دونوں کا بار گراں اٹھانے کے لئے سیٹ تیار نہیں تھی، اس لئے انہیں سب سے پیچھے جانا پڑا، اور آخر دم تک سب سے پیچھے رہے، ان کا دوسرا روپ ہم نے زاہدان ایئرپورٹ پر دیکھا تو دنگ رہ گئے، اب وہ اپنی عبا اور قبا میں بہت بڑے آیتُ اللہ دکھائی دیتے تھے، حد یہ کہ ان کی شکل بھی امام خمینی سے ملتی تھی، ہماری اردو زبان کا عربی اور فارسی ترجمہ بھی وہی کر رہے تھے۔ اس حلیے میں دیکھ کر ہم نے اُن سے ویگن سیٹ کی گستاخی کی معذرت کر دی۔ ویسے بھی وہ رات کے اندھیرے کی بات تھی، دن کی روشنی نے اسے چھپا دیا تھا ہمارے اعتذار پر وہ ہنس پڑے گویا کہہ رہے ہوں

رات کی بات کا مذکور ہی کیا — چھوڑیئے رات گئی بات گئی

ایران پہنچنے کے بعد آغا مویدی کے مدرسہ میں یہ پہلی علمی نشست تھی جس میں ہم شریک ہوئے۔ لیکن صاف بات یہ ہے کہ آغا مویدی کا طرزِ عمل ہمیں پسند نہیں آیا، لگتا یوں تھا کہ جیسے حکومت نے ان کی مرضی کے خلاف ہی ان کے ادارے میں اس تقریب کا اہتمام کیا ہے

ذاتی طور پر وہ مہمان علماء سے ملنا پسند نہیں کرتے، اس وقت مجھے یہ بھی خیال آیا کہ حکومت ایران تو آغا مویدی کے مزاج اور ذہنی رجحان سے یقیناً آشنا ہو گی، اس صورت میں اُسے ان کے "اڈے" پر اس تقریب کا اہتمام نہیں کرنا چاہیئے تھا، اگر مہمان علماء کو موصوف کی زیارت سے محروم ہی رکھا جاتا تو کونسی قیامت آجاتی مگر حکومت ایران تو شاید اس بات کو بھی انقلاب کا لازمہ سمجھتی ہے کہ مسلم ممالک سے آنے والے مہمان جب تک ہر چھوٹے بڑے آیت اللہ کے در کا طواف نہ کر لیں، اس وقت تک "وحدت" کا تصور اجاگر اور انقلاب اسلامی کا نقش ثابت ہی نہیں ہو سکتا، بہرحال جناب فاضل کی ملاقات سے ہم جتنے مسرور ہوئے تھے، آغا مویدی کی "زیارت" سے اتنے ہی مایوس ہوئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلے تو ریڈیو زاہدان والوں نے گھیر لیا، ان میں بھی ایک پاکستانی نوجوان تھے "پاک ایران دوستی" کی سچی اور اچھی تصویر، چہرے پر متانت کے آثار اور آنکھوں میں ذہانت کے انوار لئے ہوئے، خوش اخلاق اور خوش اطوار، خندہ رو، خندہ جبیں ۔ وہ مجھے، قاضی اسرار الحق اور صاحبزادہ سعید کو ریڈیو سٹیشن لے گئے، وہاں ہمارے انٹرویوز بھی ہوئے اور سٹاف سے ملاقاتیں بھی۔ انہوں نے سوالات میں سخاوت کا مظاہرہ کیا، ہم نے جوابات میں بخل سے کام نہ لیا، پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں یا ہو رہی ہیں، ان کا بھی ذکر ہوا، علماء، ریاست اور امراء حکومت کی "خدمات" کی بات بھی ہوئی ہمارے دوست سعید تو مجلس شوریٰ کے ممبر ثابت ہوئے، انہوں نے بانی مجلس شوریٰ کا نام بھی لیا اور وہ بھی ان کے فوجی عہدے کے لاحقے سمیت !

عجیب بات یہ ہے کہ یہ انٹرویوز ہماری توقع کے برعکس ریڈیو زاہدان سے نشر بھی ہو گئے اور کسی "سنسر" کے بغیر نشر ہوئے، اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوا کہ پاکستان کے بارے میں ایران کی سرکاری پالیسی وہ نہیں جو بعض مولویان کرام کی ذاتی پالیسی ہے لیکن صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ ہمارا یہ اندازہ بھی اندازۂ آخر ثابت نہ ہوا،

کیونکہ ہر نئے قدم پہ نئے تجربات، نئے مشاہدات اور نئے سے نئے حالات سامنے آتے رہے، ہر منظر پہلے منظر سے الگ اور ہر نظر پہلی نظر سے جُدا! یہ دستِ قدرت کا لکھا سفر تھا جسے جاری رکھنے پر ہم مجبور تھے، ہم یہ سوچتے ہوئے ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھتے رہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

ریڈیو اسٹیشن کا مختصر پروگرام قدرے طویل ہوگیا، ہم وہاں سے فارغ ہوکر عجلت میں ہوٹل آئے۔ کھانا کھایا، سامان اٹھایا۔ ایئرپورٹ پہنچے اور وہاں سے دو بجے تہران روانہ ہوگئے

تہران ایئرپورٹ پر استقبال کے لئے بہت سے اعلیٰ حکام موجود تھے، وی آئی پی رُوم میں چائے نوشی کے دوران ایک ایرانی عالم نے ہمیں فلسفۂ انقلاب سمجھاتے ہوئے بتایا، آپ کو یہاں بہت سی تبدیلیاں نظر آئیں گی، انقلاب کے نتیجے میں بہت سے آثار مٹے ہوئے نظر آئیں گے اور بہت سے نئے مظاہر دیکھنے کو ملیں گے، مثال کے طور پر اس وقت معزز مہمان جس جگہ تشریف فرما ہیں، شاہ کے دور میں یہاں عیاش حکمران بیٹھتے تھے، علماء یہاں پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، یہ اسلامی انقلاب کی برکت ہے کہ آج شاہ کی جگہ گدا بیٹھے ہیں، یہ کہکر اس عالم نے اس انداز میں ہماری طرف دیکھا کہ ہم بھی کچھ کہیں، ان کی بات تو درست تھی لیکن ہم فوری طور پر کوئی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، قرآن نے بروقت رہنمائی کی، ہم نے کچھ کہنے اور جوابی طور پر ایک مفصل تقریر سننے کے بجائے اس آیت اللہ کو آیت سنا کر خاموش کر دیا اَللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ

ایئرپورٹ سے نکلے تو سابق "حیات" اور موجودہ "آزادی" ہوٹل میں جا پہنچے، اس ہوٹل کے سابقہ اور موجودہ نام پر غور کیا تو قیدِ حیات سے آزاد ہونے کا تمام مفہوم سمجھ آگیا، آزادی شمالی تہران کے آخری اور ماڈرن علاقے میں ہے اسلامی انقلاب کے بیشتر دشمن اسی

علاقے میں رہتے ہیں۔ آج کل ان سرکشوں کو منافقین خلق کہا جاتا ہے۔ آزادی کے
سامنے بلند پہاڑی پر غلامی کی تاریخی یادگار ایون (EVIN) جیل عبرت کا منظر پیش کر رہی ہے
شاہ کے دور میں "ایون" ساوک کا عقوبت خانہ تھی۔ آج "پاسداران انقلاب" کا عبادت خانہ
ہے مگر اس کی آنکھ سحر خیز ہے نہ جبیں سجدہ ریز اس کا بیرونی منظر عبرت سرائے دہر
ہے اندرونی منظر خدا جانتا ہے یا اندر جانے والے، ایک بات مشہور ہے کہ جو اس کے
اندر گیا، باہر نہیں آیا، شاہوں کے دور سے گداؤں کے عہد تک اس کا منہ کھلا رہا کئی انسان
اس کے پیٹ میں سما گئے، صدائے مزید ہنوز جاری ہے، دور بدلے، زمانے بدلے، عہد
بدلے، قرنوں نے انگڑائی لی، انقلاب نو آیا ایون کا ستارہ جب بھی عروج پر تھا اب بھی عروج
ہے۔ کل بھی اس کے محافظ موجود تھے، آج بھی موجود ہیں، یہ اُن کی بھی ضرورت تھی، ان کی
بھی ضرورت ہے، یہ وقت اور ماحول کی ضرورت ہے، اہلِ وقت اور
اہل ماحول کی ضرورت ہے، رندِ خرابات کی ضرورت ہے "قبلہ حاجات کی ضرورت ہے" اہل
دھرم کی ضرورت ہے، شیخ حرم کی ضرورت ہے، ستمگروں کی ضرورت ہے، پیشہ وروں کی
ضرورت ہے، مجرموں کی ضرورت ہے، محرموں کی ضرورت ہے، ظالموں کی ضرورت ہے
عالموں کی ضرورت ہے — سب کی ضرورت تھی اور سب کی ضرورت ہے "نظریۂ ضرورت کا
قانون اس کے دروازے سے گزرتا ہے، جو شخص اس پر تسلط حاصل کر لیتا ہے ولیٔ
کامل دکھائی دیتا ہے، خدائی اختیارات اس کے قبضے میں ہوتے ہیں، اسباب قدرت اس
کے اشارے پر کام کرتے ہیں، رفتارِ زمانہ اس کی انگلیوں میں ہوتی ہے، نبض کائنات
اس کی مرضی سے چلتی ہے، موت و حیات کے فیصلے اس کی جنبش لب سے وابستہ ہوتے
ہیں، آزادیاں اور پابندیاں اس کی چشم ابرو کی محتاج ہوتی ہیں، وہ خدا کی زمین پر خدا کے
بندوں کا خدا ہوتا ہے" کیونکہ اس کے پاس طاقت ہوتی ہے — اور تاریخ گواہ ہے کہ
طاقت نے صداقت کی حکمرانی کو کبھی قبول نہیں کیا، یہ وہ ہستی ہے جو ہر بلندی و پستی کو اپنے

ساتھ منسلک کر دیتی ہے اور اس کا نعرہ — نعرۂ ہمہ اوست ہوتا ہے

مطربِ آتش نوا ہم ساقیٔ میخانہ ہم — رند مشرب ہم خراب ساغر و پیمانہ ہم
شیخ کعبہ ہم امام ملّتِ رندانہ ہم — مالک ہر دو جہاں ہم صاحب ہر خانہ ہم
فخرِ موجودات ہم ہم رازدارِ ہست و بود — واقفِ سرِ حقیقت، نعرۂ مستانہ ہم

رونق بزم جہاں قائم ہمارے دم سے ہے
عظمت بیت الحرم، ازِ بیا رِشِ میخانہ ہم

ایون اور آزادی ——— اجماع لفظی کے اعتبار سے ایے دن آزادی، ایک ہوٹل ایک جیل، دونوں آمنے سامنے، ہوٹل سے جیل نظر آتی ہے، جیل سے ہوٹل — دو عمارتیں دونوں شاہکار، ایک کرم کی بارگاہ۔ ایک ستم کی یادگار، ایک میں گُل، ایک میں رگ گل ایک میں تارے، ایک میں شرارے، ایک میں نغمہ، ایک میں حرف غم، ایک میں شادی ایک میں مرگ، دونوں کا اجتماع شادیٔ مرگ، اگر وہاں پر مجھے خدا دکھائی دیتا تو یہ سوال ضرور کرتا

خداوندا ترے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

تہران ایئر پورٹ سے آزادی تک مہمان علمائے جن کاروں میں سفر کیا وہ ہمارے ملک میں صرف گورنروں کے استعمال میں آتی ہیں، وہ بھی کبھی کبھی، ایک دوست گاڑی میں بیٹھتے ہی میرے کان کے قریب ہو کر بولے "یہ اسلامی عیاشی ہے" میں نے کہا فی الحال تبصرہ محفوظ رکھئے ورنہ خود غیر محفوظ ہو جائیں گے، اگر آپ کی بات آیت اللہ خلخالی نے سُن لی تو میدانِ آزادی میں ٹکٹکی سے باندھ کر کم از کم گیارہ کوڑے لگوائیں گے۔

آزادی میں ہمارا داخلہ ہوا، لیکن سامان بکھری اور جامہ تلاشی کے بعد، چونکہ اس سے پیشتر میر جاوا، خادر ہوٹل، زاہدان اور تہران ایئر پورٹ پر بھی ہم اس "عاشقانہ درازدستی"

کے تجربات سے گزر چکے تھے اس لئے اب یوں سپر ڈال دی جیسے مریض اپنے طبیب یا عاشق اپنے حبیب کے سامنے ڈال دیتا ہے آزادی میں کمرے الاٹ ہونے سے پہلے ترجمان الاٹ ہوئے، لکھنؤ کے حسن معردفی اور بنارس کے سید ظفر ہمارے حصہ میں آئے، یہ دونوں باصلاحیت برخوردار اللہ کے فضل سے ذہنی طور پر جتنے چست تھے عملی طور پر اتنے ہی سست اور پھسڈی، لکھنؤ کی نزاکتیں بجا، صبح بنارس کی اپنی شان ہے اور بنارس کے ٹھگ اس پر مستزاد —— حسن معردفی ترجمہ اور ترجمانی دونوں کرتے تھے لیکن ظفر کو دونوں سے گریز تھا، سب سے بڑا المیہ یہ کہ "آزادی" میں ہماری آزادی رفت گزشت ہو گئی، اپنی مرضی سے سونا نہ اپنی مرضی سے جاگنا اور نہ ہی اپنی مرضی سے کہیں آنا جانا، ہم بھی یہ سوچ کر صبر و شکر کر بیٹھے

مرضیٔ مولیٰ از ہمہ اولیٰ

قید "آزادی" میں آنے والے ہم پہلے پاکستانی تھے، دوسرے روز مولانا سید عبد القادر آزاد بھی اسیر آزادی ہونے کے لئے پہنچ گئے، اگرچہ ان کے نام اور اس مقام میں معنوی اشتراک تھا لیکن جس طرح آزادی اہل انقلاب کے قبضے میں تھا، اسی طرح ہم اور مولانا آزاد، آزادی کی گرفت میں تھے، گرفت آزادی کی ہو یا غلامی کی، طبیعت دونوں سے ابا کرتی ہے، گرفت میں آنے والے آزاد ہوں یا غلام، حالت دونوں کی یکساں ہوتی ہے، ایک دل کو روتا ہے دوسرا جگر کو پیٹتا ہے، ایک گل کو پکارتا ہے دوسرا بلبل کو، ایک کی سوز و سازِ رومی میں کٹتی ہے دوسرے کی پیچ و تاب رازی میں گزرتی ہے، ایک میں غزنوی کی تڑپ ہوتی ہے دوسرے میں زلفِ ایاز کا خم، یہ سب آبِ گل ایران اور خاکِ تبریز کے کرشمے ہیں۔

آزادی سے باہر برف باری، اندر ہمارے من کے پنچھی کی آنکھوں سے جوئے خوں جاری اور اس سفید و سُرخ انقلاب کے دوکش پہ میرے خیالات کا قافلہ رواں دواں،

کھڑکی سے باہر کھڑے کھڑے سرسری سی نظر ڈالی، مقصد ماحول سے لطف اندوزی اور ہول سے آزادی تھا مگر نظر پھسلتی ہوئی جیل پہ جا ٹھہری، عین اسی لمحے احساس ہوا جیل ہوٹل سے مخاطب ہے :۔

"اس بات پہ فخر نہ کر کہ تیرا نام آزادی ہے، ایک نام ہی کی نسبت سے تیرا امتیاز قائم ہے، ورنہ تو کیا تیری حقیقت کیا؟ تو شیدائے جمال، میری آغوش میں جلال و جمال، تیری چاہتیں محدود، میری ہیبتیں لامحدود، تو اپنے ماحول میں بند، میں ہر ماحول میں سربلند، تیری آزادیِ وقتی، میری آبادی دائمی، تجھ سے نفاق جنم لے، مجھ سے آفاق علم پائے، تو حسنِ ظاہر کا طلبگار، میں حسنِ باطن کی آبشار، تو فریبی، میں دلفریبی ہوں مگر تیرا نام بلند اور میرا مقام پست!

اتفاقات ہیں زمانے کے

تیرا نام بلند سہی، میرا مقام بھی کم نہیں، تیرے افرنگی صوفوں پر بیٹھنے اور ایرانی قالینوں پر چلنے والے میرے ہی گھر کا توشہ ہیں، تو انسانوں کی تربت، میں حکمرانوں کی تربیت، تیری آغوش میں جسم ڈھلتے ہیں، میری گود میں اقتدار کی پرورش ہوتی ہے میرے پیٹ سے کئی صاحب اقتدار نکل کر تیرے سرمریں وجود میں گم ہو گئے، میں نے کچھ دیا ہے لیا نہیں، تو نے سب کچھ لیا ہے' دیا کچھ بھی نہیں' تو نے کل جنہیں غدار کہہ کر میرے حوالے کیا تھا میں نے ان کو تختِ اقتدار پر بٹھا دیا، آج جو غدار میرے سپرد کئے گئے ہیں میں کل وفادار بنا کر مستقبل کے حوالے کر دوں گی، ہم دونوں کا کام انسانوں کی پرورش ہے، تم جسم کی دیکھ بھال کرتی ہو، میں دماغ کی بالیدگی پر مامور ہوں تیرے ہاں مہمان آتے ہیں تو میرا گھر بھی بھرا ہوا ہے، تیرے مہمان نگر نگر کے لوگ میرے مہمان میرے وطن کے بیٹے، میرے وطن کے فرزند۔

تہہ خاک تیری نمود ہے سرِ عرش میرا وجود ہے تیرا آستاں ہے زمیں پر مرا آسمان پہ تخت ہے

تہران کے ہوٹل آزادی میں ہونے والی سیرت کانفرنس میں بیالیس ممالک کے علماء شریک تھے، باقاعدہ دعوت پر آنے والوں کی تعداد ۱۸۰ تھی، ان میں سے ۲ ہم کا تعلق پاکستان سے تھا، یہ اپنے بخت رسا کی بات ہے کہ بعض نام ہی اپنی عظمت کے پرچم کو اٹھائے پھرتے ہیں، پاکستان بھی ایسا ہی نام ہے، یہ ہفت حرفی نام بسا اوقات ہفت آسمان کی نمائندگی کر گزرتا ہے، بابائے قوم نے اس ملک کے لئے کیا کیا ترک نہیں کیا؟ صحت، جوانی، اولاد، مال و منفعت، اگر یہ نام کام کا نہ ہوتا تو پہلے روز ہی مسترد ہو جاتا مگر اس کے پیچھے تو اقبال و رحمت کے دماغ تھے، عالم اسباب میں اس کی زندگی و نمائندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے نام میں اقبال و رحمت کا مفہوم شامل ہے، یوں تو ہندوستان میں اس پاک پودے کی کئی صدیاں خون سے آبیاری ہوتی رہی، برصغیر کے پہلے شہید سے آزادی کے آخری چراغ تک ـــــ ہر ایک وجود نے اسے وجود میں لانے کے لئے اپنا وجود قربان کیا لیکن جب اس کا وجود متشکل ہو رہا تھا، اس وقت مسلمانان ہندوستان نے اپنے اجتماعی خون سے اسے جو غسل دیا وہ تاریخ عالم کا ایک حیران کن واقعہ ہے، میرا خیال ہے کہ اسی عمل کے اثرات اس کی نجات کا باعث ہیں۔

تہران کانفرنس میں اس سال میزبان ملک نے جو دو نکاتی پروگرام پیش کیا اس کا ایک حصہ اس کانفرنس کی نویں قرارداد میں بھی شامل ہے، ہمارے نزدیک یہ پروگرام عالم اسلام کے لئے بہت دور رس نتائج کا حامل تھا اور اس پروگرام کے ردّ و قبول کے سلسلے میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر کوئی مؤقف اختیار کرنا تھا، پاکستان سے محبت اور ہمدردی رکھنے والوں کی کمی نہیں تھی تاہم نے ان سے بات کی تو بات بن گئی، ہمخیال دوست زیادہ تھے دوسرے کم، میں نے مولانا عبدالقادر آزاد سے کہا یہ لوگ تو آٹے میں نمک ہیں، مولانا آزاد نے دوستوں کو مشورہ دیا ـــــ یہ بات ہمیں طے کر لینی چاہیئے کہ جہاں اصول کی بات ہو ہمارے آٹے میں کوئی نمک کے طور پر شامل ہو تو بسم اللہ، ہمیں اپنا آٹا دوسروں کے

نک میں شامل کرنے کی ضرورت نہیں، کانفرنس جب تک جاری رہی، پروگرام کے نقشے جب تک بنتے اور سامنے آتے رہے اس طے شدہ اصول کو کسی پاکستانی نے فراموش نہیں کیا۔

بھارت کے ایک مشہور بریلوی عالم علامہ ارشد القادری ہیں، کانفرنس میں وہ بھی شریک تھے، میں نے میزبانوں کے انقلابی پروگرام کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی تو کہنے لگے ہمارا خیال تھا کہ آل نجد روضۂ رسولؐ کو منہدم کر دے گی، لیکن اب سوچتا ہوں کہ اگر آل عجم وہاں تک جا پہنچی تو کعبے کا بھی خدا حافظ!

مولانا اور ان کے رفقاء کی پہلی بات سے ہمیں ہمیشہ اختلاف رہا ہے لیکن حالات کا دھارا جس سمت بہہ رہا ہے اسے دیکھ کر اس دوسرے لطیفے پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔

پاکستان سے تعلق رکھنے والے کچھ علماء برطانیہ سے بھی تشریف لائے تھے، ہمارے ایک دوست کو خدشہ تھا کہ کانفرنس میں زیر بحث آنے والے کئی ایک نکات ان کی روشن خیالی کی نذر ہو جائیں گے لیکن جب ان کے علمی کمالات سامنے آئے تو ہمیں حیرت اور ہمارے اس دوست کو ندامت ہوئی، یہ حضرات اپنے وطن، اپنی قوم اور عالم اسلام کے حالات و مسائل کے بارے میں ہم سے کہیں زیادہ باخبر تھے، مشاورتی نشستوں میں ان جری انسانوں نے جو کارکردگی دکھائی وہ قابل رشک تھی، ان علماء میں مولانا نثار احمد، مولانا طفیل حسین شاہ مولانا عبدالرحمٰن پٹیل، جناب رشید احمد صدیقی، ایس ایم واسطی، مولانا حبیب الرحمٰن اور مولانا ظفر محمود فراشوی قابل ذکر ہیں۔

مولانا نثار احمد جماعتِ اسلامی کے تربیت یافتہ ہیں، وطن مالوف ضلع ہزارہ ہے علاقے کی آب و ہوا اور جماعت کے فلسفۂ صبر و رضا نے مل کر ان کے دل میں استقلال، دماغ میں اعتدال اور مزاج میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا ہے، ان کی رفتار و گفتار میں سادگی اور وقار ہے، وہ ہنستے مسکراتے ہوئے ایسا سیدھا سوال اور کھرا استدلال کرتے ہیں کہ مخاطب

ناک آؤٹ ہو جاتا ہے، عام حالات میں کم گو مگر اظہار حق کے موقع پر تیز رو ہیں، اس باب میں حضرت والہ نظیر اکبر آبادی کے پیروکار نظر آتے ہیں

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں، انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یہ سودا دست بدستی ہے

مولانا طفیل حسین شاہ کا خمیر تو گجرات کی مٹی سے اٹھا ہے لیکن ضمیر گل حجازی سے تیار ہوا ہے، ان کے دل میں دین کا درد اور زبان میں اخلاص ہے، لہجہ دھیما، انداز شگفتہ اور آواز بجنتہ، پہلے تولتے اور پھر بولتے ہیں ان کا تعلق بھی جماعت اسلامی سے ہے، مولانا عبدالرحمٰن پٹیل بھی گجرات سے تعلق رکھتے ہیں، کم گو اور راست رو، خوش دل و خوش نظر، سادہ و معصوم، انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انگلستان میں بھی خدا پرستی کے قابل و بد نمونے موجود ہیں۔

جناب رشید احمد صدیقی اور ایس ایم واسطی معروف شخصیات ہیں، حضرت واسطی میں راستی کے پہلو نمایاں ہیں، نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز کی چلتی پھرتی تصویر، میر کارواں چاہے تو رخت سفر کے طور پر ساتھ رکھ سکتا ہے —— رشید احمد صدیقی اچھے آدمی ہیں لیکن مشہد میں کوٹ بدلتے ہوئے ان کے ہاتھ سے میری نظر کا چشمہ ٹوٹ گیا۔ اب اس ارتکاب "جرم" کے بعد ان کی تحسین و ستائش ہمارے حوصلے کی بات ہے، ان کا تعلق بھی "طائفہ منصورہ" سے ہے، ان کی شخصیت میں بھی گہرائی اور باتوں میں بھی گہرائی ہے، طبعاً ڈپلومیٹ ہیں، اس لئے ملفوف زبان میں بات کرتے ہیں، مذاکرات میں ایسے لوگ بہت کامیاب ہوتے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن —— افسوس کہ ان کا ناک نقشہ ذہن میں محفوظ نہیں رہ سکا اور نہ ہی ان کے حوالے سے کوئی بات حافظے میں سلامت ہے، بہت غور کیا مگر یاد نہ آیا۔ کوئی بات نہیں تبصرہ محفوظ رکھتے ہیں، داشتہ آید بکار۔

مولانا ظفر محمود فراشوی دلچسپ شخصیت ہیں، بریلوی مکتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں، مگر اس مکتب کے بہت سے ہم سبق لوگوں سے خاصے مختلف ہیں، ان کی باتوں میں سلیقہ اور قرینہ ہے

تمام وقت علامہ ارشد القادری کے ساتھ گزارتے تھے، جاتے وقت ہم سے مل کر نہیں گئے اللہ تعالیٰ ان کے اس "گناہ" کو معاف فرمائے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

برطانیہ سے آنے والے ان تمام علماء نے اپنی اپنی بساط کے مطابق پاکستان کی نمائندگی کی اور خوب کی، ایک میٹنگ میں صدر محفل نے "مستضعفین" جہاں کا سوال اٹھایا تو مولانا شاہ احمد نے اس آیت اللہ کے جواب میں بڑا دلچسپ نکتہ پیش کیا۔

"جناب صدر! کس کافر کو آپ کے جذبے کی صداقت، عزائم کی پختگی اور رائے کی اصابت سے انکار ہے؟ جو لوگ مسلم ممالک میں مسلم حکومتوں کے ہاتھوں پس اور پٹ رہے ہیں ان کی نصرت و اعانت ہم سب کا انسانی، اخلاقی اور دینی فریضہ ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ آپ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہیں، آپ کے ہاں "مستضعفین" کی تعریف عجیب ہے۔ یہ خانہ ساز تعریف وقت، حالات اور مقامات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے، جب افغانستان، عراق یا کسی دوسرے ملک میں حکومت سیاسی مخالفین سے انتقام لیتی ہے تو آپ چیخ اٹھتے ہیں، لیکن جب یہی ظلم شام میں ہوتا ہے اور صرف ایک دن میں سینکڑوں اخوان کا خون بہایا جاتا ہے تو آپ کے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی! آخر کیوں؟

آپ کا اندازِ فکر کتنا عجیب ہے کہ افغانستان اور عراق میں مظلومانہ موت مرنے والا تو آپ کو مظلوم نظر آتا ہے مگر شام میں وحشت کا شکار ہونے والا آپ کو مظلوم نہیں دکھائی دیتا بہتر ہوگا کہ پہلے "مستضعفین" کی کسی ایک تعریف پر متفق ہو جائیں، اس کے بعد اس موضوع پر بات کی جا سکتی ہے

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ جانے وہ نظر کیا

تہران میں قیام کے دوران ہمیں ایران کی اہم شخصیات سے ملنے اور اہم مقامات دیکھنے

کا بھی موقع ملا ، شمالی تہران کے مقام جمران میں امام خمینی کا دیدار ہوا، قم میں آیت اللہ منتظری، آیت اللہ شہاب الدین مرعشی نجفی اور آیت اللہ گل پائگانی کی زیارت کی، مشہد میں آیت اللہ طبسی اور آیت اللہ شیرازی سے ملے مجلس شوریٰ میں آیت اللہ خلخالی اور ہاشمی رفسنجانی کو دیکھا تہران میں علی خامنہ ای ، ہادی خامنہ ای، آیت اللہ طاہری اور مقدس نژاد سے باتیں اور ملاقاتیں ہوئیں، ان سب شخصیات کے بارے میں ہماری ایک رائے اور تأثر ہے۔

امام خمینی ذاتی اثر آفرینی کے اعتبار سے جوئے نغمہ خواں ہیں اور امام منتظری آہوئے تاتار، شہاب الدین مرعشی کرمکِ شب تاب اور گل پائیگانی لالۂ صحرائی، خلخالی مرغ لاہوت اور علی خامنہ ای حورِ بہشتی، ہادی خامنہ ای سروِ انجم اور آیت اللہ شیرازی شاہدِ رعنا، مقدس نژاد کفیل اور آیت اللہ طاہری نعم الوکیل

خمینی بلند قامت اور ان کے جانشین منتظری کوتاہ قامت ہیں، دوسری خصوصیات میں کوئی مناسبت نہیں، ایک لیڈر، ایک درویش، ایک رہنما، دوسرا بے نوا، پہلا مؤثر، دوسرا بالکل غیر مؤثر ـــ شہاب الدین مرعشی اور گل پائیگانی علمی خود اعتمادی کا نادر شاہکار ہیں، یہ دونوں بزرگ نئے دور میں پرانے اسلاف کا نمونہ ہیں، قم کے حوضۂ علمیہ کی رونق انہی کے دم قدم سے ہے۔

حوضۂ علمیہ کی بات آئی ہے تو یہ بتا دیا جائے کہ حوضۂ علمیہ کیا ہے؟ عام طور پر یہ نام سنتے ہی ذہن میں کسی یونیورسٹی کا نقشہ آجاتا ہے، فی الواقع ایسا نہیں، قم میں طلبا کیلئے مدارس کے بجائے قیام گاہوں کا بندوبست ہوتا ہے، ان مقامات پر تعلیم نہیں دی جاتی طلبہ کو تعلیم دینے کے لئے ہر مسجد میں اساتذہ موجود ہوتے ہیں، یہ طلبہ کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس مسجد میں کونسی کتاب پڑھنا چاہتے اور کس استاد سے پڑھنا چاہتے ہیں؟ اس قسم کی مکتبی مساجد پچاس ساٹھ کے لگ بھگ ہیں اور قم کی انہی مساجد کو حوضۂ علمیہ کہا جاتا ہے۔

مشہد میں حضرت امام علی رضاؑ کا روضہ مرجع خلائق ہے، اس کی عمارت کے ایک حصہ میں آیت اللہ طبسی تشنگانِ علوم کی پیاس بجھاتے ہیں، امام طبسی کی ذاتی لائبریری بڑی شان رکھتی ہے۔ اس لائبریری میں قلمی نوادرات کا بھی بہت بڑا ذخیرہ ہے، امام طبسی سے ملاقات کے بعد اسی شام آیت اللہ شیرازی کی قیام گاہ پر ایک تقریب کا اہتمام تھا، اس تقریب میں پہلے آیت اللہ شیرازی کے نوجوان فرزند دلبند نے خطاب کیا اور بعدازاں آیتُ اللہ شیرازی نے اظہارِ خیال فرمایا۔

آیتُ اللہ شیرازی کی تقریر کے دوران مولانا نثار احمد نے ہال کی دیوار پر لگے ہوئے ایک نمائشی قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے پڑھیئے! میں نے پوچھا کیا کوئی خاص بات ہے؟

کہنے لگے نیچے سے اوپر ساتویں سطر پڑھ لیں، سب کچھ معلوم ہو جائے گا! میں نے جو اس سطر کو تلاش کر کے پڑھا تو اتحاد اسلامی کا بھانڈا پھوٹ گیا، یہ ایک دعائیہ عبارت تھی جس میں حضرت ابوسفیانؓ، حضرت معاویہؓ اور دوسرے اصحاب کبار پر لعنت کا ورد کیا گیا ہے۔ اب جو میں نے غور کیا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ اوپر سے ٹھیک ساتویں سطر میں یہی بددعا خلیفہ اول اور دوم کے بارے میں بھی موجود تھی، میں نے مولانا نثار احمد سے کہا کہ اب آپ اوپر سے ساتویں سطر پڑھیں اور مسلم اتحاد کے دعوے کی حقیقی بنیاد تلاش کریں...!

ہمیں یہ جان کر سخت رنج ہوا کہ آیت اللہ خمینی کے ایک دستِ راست نے چالیس ملکوں کے علماء کے سامنے اس قالین کی نمائش کیوں کی ہ اگر یہ باتیں ان کے عقیدے میں داخل ہیں تو ہوتی رہیں، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ایک طرف امام خمینی کو امامِ اُمت قرار دیا جائے اور دوسری طرف ان کی حکومت کے زیرِ اہتمام پوری امت کی دلآزاری میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی جائے، کیا یہ بات بھی امامِ امت کے فرائض

میں شامل ہے کہ وہ اکابرین امت کی توہین کریں؟

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

کم از کم یہ تو کوئی بڑی بات نہ تھی کہ جس روز چالیس مسلم ممالک کے علماء کو مدعو کیا گیا، اس روز اس قالین کو ہٹا دیا جاتا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس دلآزار قالین کی نمائش بھی پروگرام کا ایک حصہ تھی! گویا ایران کے قابل احترام علماء اس بات پر اتحاد چاہتے ہیں کہ امت مل کر اپنے پیغمبر کے رفقاء کے خلاف تبرّٰی بازی شروع کر دے!

تقریب کے اختتام پر نعرے شروع ہوئے تو سر فہرست یہ نعرہ تھا "یاایُّھَا المُسلِمُونَ اِتَّحِدُوا اِتَّحِدُو" - یہ نعرہ سنکر مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے "اِتَّحِدُو" کی جگہ "اُنتَشِرُوا اِنتَشِرُو" کی صدا لگائی، بظاہر تو اس موقع پر اس صدا کا جواز بھی تھا کہ یہ لوگوں کے منتشر ہونے کا وقت تھا، لیکن میں اچھے انداز میں اپنے میزبانوں کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ آپ کا عمل اتحاد کے خلاف ہے ـــــ مسٹر مقدس نژاد میری آواز کا مفہوم سمجھتے ہوئے بولے۔

"پلیز برادر یونٹی یونٹی" ـــــ میں نے کہا "نو یونٹی" اور اسکے ساتھ ہی ہم ہال سے باہر آگئے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، کاش میں فوٹو گرافر ہوتا۔ یا کوئی ایسا دوست یہاں موجود ہوتا جو اس قالین کی تصویر بنا لیتا اور میں اپنے ملک کے لوگوں کو اتحاد اسلامی کی یہ تصویر دکھا کر اپنی بات کی تصدیق کرا سکتا، میں نے دائیں بائیں دیکھا، لیکن کوئی شناسا فوٹو گرافر نظر نہ آیا، دل پہ ہاتھ رکھے، لب پہ آہیں، آنکھوں میں آنسو لئے اور دوش پہ دینی حمیت کا جنازہ اٹھائے واپس آگئے، قریب ہی سے مرزا غالب کی آواز آئی

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا

اب خدا کا کرنا کیا ہوا؟ یہ بھی سن لیجئے! واپسی سے دو روز قبل جب ہمیں سرکاری طور

پر تصویری البم پیش کئے گئے تو میری دلی مراد پوری ہو گئی، کیونکہ میری البم میں وہ تصویر موجود تھی جس کے لئے مشہد میں دل بے تاب ہوا تھا اور یہ تصویر زبانِ حال سے کہہ رہی تھی

مبادا وا ورِ محشر تمہیں نہ پہچانے مجھے بطورِ ثبوت وگواہ لے جاؤ

ایران کی ان علمی شخصیات میں صدر جمہوریہ ایران علی خامنہ ای اور ان کے بھائی ہادی خامنہ ای کا مقام بہت بلند ہے، ان کی علمی عظمت اور روحانی وجاہت نے مجھے بہت متأثر کیا۔ جناب ہادی خامنہ ای تو ہر مقام پر ہمارے ساتھ رہے، میں نے ایک بار ان کے نام کے لاحقے "خامنہ ای" کے بارے میں استفسار کیا تو ہنس کے ٹال گئے۔ مگر ایک واقفِ درونِ خانہ نے انتہائی رازداری سے بتایا کہ یہ دونوں بھائی "خمین" کے رہنے والے ہیں، چونکہ قائد انقلاب امام خمینی کے نام سے مشہور ہیں، وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی دوسرا شخص بھی خمینی کہلائے، کیونکہ اسطرح ان کے نام کی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا "خمین" کے رہنے والے دوسرے امام اپنے نام کے ساتھ خمینی کے بجائے "خامنہ ای" لکھتے ہیں۔

جناب آیت اللہ خلخالی کو ایک دنیا جانتی ہے اور اتنا جانتی ہے کہ مزید کچھ جاننے کی حاجت ہی نہیں، البتہ آیت اللہ طاہری کے بارے میں اتنا ہی بتا دینا کافی ہے کہ موصوف ایران کے سرکردہ علماء میں شمار ہوتے ہیں، وہ ڈھنگ سے بات کرتے ہیں، ان کا انداز دلربا ہے اور شخصیت دلفریب۔

دلفریبی اور ہر دلعزیزی کے حوالہ سے جناب ہاشمی رفسنجانی کی شخصیت سب سے نمایاں ہے، بنی صدر اور قطب زادہ کے بعد رفسنجانی ایران کی سب سے بڑی سیاسی شخصیت ہیں، بعض امور میں ان کی مہارت کا بنی صدر اور قطب زادہ بھی مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، ان دنوں وہ مجلس ملی کے چیئرمین ہیں، ان کے چہرے پہ پھولوں کی لطافت اور باتوں میں شہد کی مٹھاس

ہے ایک ہمہ گیر شخصیت اور ایک بلند پایہ سیاستدان

اللہ کرے زورِ عمل اور زیادہ

ایران کی شخصیات کے بعد اہم مقامات پہ نظر ڈالیں تو خمینی کا جمران ایران کی جان اور شہدا، انقلاب کا قبرستان" بہشت زہرا" کربلا ہے، دانشگاہ تہران شکوہِ علم، مجلس ملی گنبدِ افراسیاب اور نیشنل ایران اقتصادی نمائش ہے تہران کے سینے پہ عظمت و برتری کے یہی تمغے ہیں

شہروں کی بات آئی ہے تو دوسرے شہروں پہ بھی نظر ڈالتے جائیے!

ابادان ورقِ عبرت، خرم نشانہ حرب، ہویزہ، محض ریزہ، اہواز شہرِ بے آواز، سوسنگرد، بھنور گرد، بوستان —— ایک ایسا نشان جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کبھی زندگی اور اسکی رونقیں تھیں، اب کچھ بھی نہیں، سترہ ہزار مربع میل علاقہ ملبے کا ڈھیر ہے، سولہ بڑے اور آٹھ چھوٹے شہر صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں، دیہات کا کوئی شمار نہیں، مہذب دنیا کا کوئی انسان اتنی بڑی تباہی کا تصور ہی نہیں کر سکتا، ہر شہر اولاً بمباری کی زد میں آیا اور بعد ازاں بلڈوز ہوا میں نے تہران کے بازار لالہ زار میں ایک شہری سے اس تباہی کا سبب دریافت کیا تو اس نے ایسا حیرت انگیز انکشاف کیا کہ مجھ پہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، مجھ میں یہ بات سننے اور سمجھنے کی تاب نہ تھی، آپ میں ہے تو سن لیجئے :۔

"ان شہروں پر بمباری تو عراق نے کی تھی مگر انہیں بلڈوز ہم نے خود کیا ہے"

وجہ ؟

کہنے لگے :۔

"اس تخریب میں ہماری تعمیر کا راز مضمر ہے" اگر ہم ایسا نہ کرتے تو دس لاکھ پاسدار وطن کی عظمت پہ مرمٹنے کے لئے تیار نہ ہوتے، ان پاسداروں میں آپ کو جو جذبہ نظر آرہا ہے اسے تباہی بربادی کا یہی منظر برقرار رکھے ہوئے ہے۔"

میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص انقلاب کا نمائندہ تھا یا "منافقین خلق" کا ترجمان؟ لیکن

اس کی یہ بات بہت حیرت انگیز تھی

آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

دل تو چاہتا ہے کہ ایرانی شخصیات اور مقامات کا تفصیلی تذکرہ ہو، لیکن عملاً ایسا ممکن نہیں، کیونکہ ہر مقام کی دید اور ہر فرد سے گفت و شنید ایک مستقل کہانی ہے اور ہر کہانی میں کئی ہوشربا کہانیاں ——— جو زمین انقلاب آشنا ہوتی ہے اس میں قدم قدم پر خوشی کے قصّے، غم کی کہانیاں یا پامردی کے ماجرے اور نامرادی کی داستانیں جنم لیتی ہیں۔ پھر انہی قصوں، کہانیوں، کہاوتوں، حکایتوں اور روایتوں سے مستقبل کی تاریخ بنتی ہے، فی الحال یہ تاریخ ادھیڑ بن میں ہے اور مستقبل پہ جاں کنی کا عالم، ایسے میں قلم اٹھتے ہی قلم ہو جاتے ہیں

صبا کی مست خرامی تہہ کمند نہیں۔
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

قالینِ تبرّیٰ ــــــــــ جسے پڑھ کے بچے ماں باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

سیرت کانفرنس ــــــــ فیضانِ سیاست عام سہی عرفانِ سیاست عام نہیں۔

نقشِ انقلاب
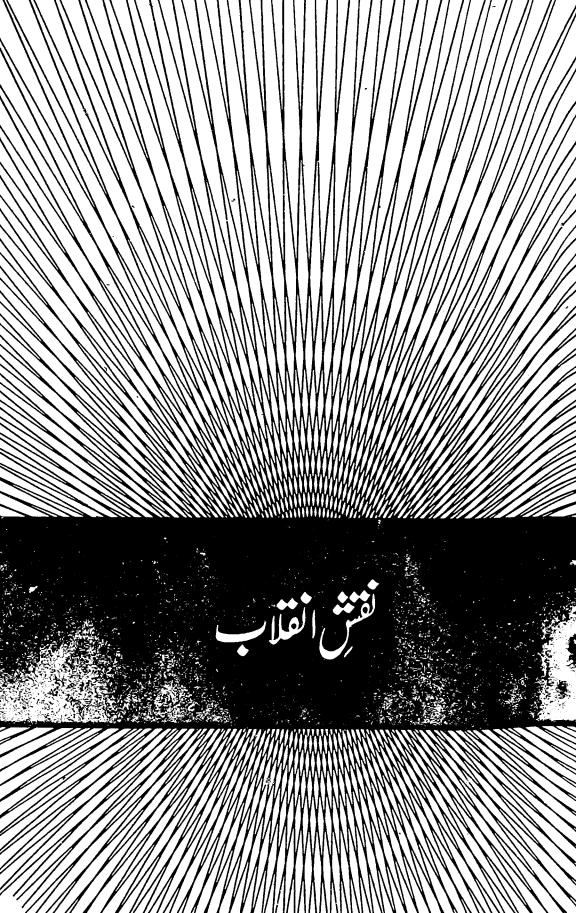
اپنے کیمرے، قلم، گھڑیاں اور دھات سے بنے جملہ "ہتھیار" کمروں میں چھوڑ جائیں ہم چہار یاری لوگوں کا "ہتھیاروں" سے ویسے بھی کوئی واسطہ نہیں تھا، ہمیں تو ان کی دلدہی و دلداری مطلوب تھی، اس لئے یہ اعلان ہمارے لئے ناگوار خاطر بنا نہ بارِ خاطر!

امام خمینی کے سادہ معیار زندگی کی بہت سی کہانیاں سن رکھی تھیں، لیکن دید شنید پہ غالب رہی، خیال آیا کہ قصور روایت کا نہیں، ہماری سماعت کا ہے، کہنے والوں نے جسے "کشادہ" کہا تھا، ہم نے اسے "سادہ" سمجھ لیا، امام کا دولت کدہ شاہ کا محل تو نہیں، لیکن اتنا بے محل بھی نہیں، بلکہ اس عمارت سے وابستہ یہ شے اضافی ہے کہ جس مقام پر امام کا قیام ہے اس کے چاروں طرف تین میل کے علاقے میں کسی کا قیام نہیں، مکانات کی چھتوں، چوباروں اور گلیوں میں پاسداروں کی پاسداری ہے، جن کی تعداد ستر ہزار بتائی جاتی ہے، نسبتاً بلند عمارتوں پر فضا میں مار کرنے والی توپیں نصب ہیں اس علاقے پر کسی طیارے کو پرواز کی اجازت نہیں،

امام خمینی جس ہال نما کمرے میں لوگوں کو شرفِ ملاقات بخشتے ہیں، اس کی پختہ دیواروں پر مٹی سے لپائی کر رکھی ہے، وہاں پر موجود ہر چیز کی علت سمجھ آئی مگر اس عمل کی حکمت سمجھ نہ آئی، ہال میں جنوباً اور شمالاً آمنے سامنے دو بالکنیاں بنی ہوئی ہیں ایک بالکنی پہ کرسی اور دوسری پہ ٹیلی ویژن کیمرے، کیمروں کے پیچھے پاسداروں کی قطار۔ ہمیں اس طرح بٹھایا گیا کہ نظر کرسی پہ رہے، شاید اس لئے کہ علماء پر کرسی کی اہمیت واضح ہو اور یہ محراب و منبر پہ قناعت کرنے کے بجائے کرسئ اقتدار تک جانے کی بھی جسارت کر سکیں مگر

ہر مولوی کے واسطے یہ کرسیاں کہاں

مہمان بیٹھے تو جناب مقدس نژاد نعرے لگانے کے لئے اٹھے، یہ حضرت مقدس

ہمارے طارق عزیز کے ہمزاد ہیں، طارق عزیز تو شاید صرف "نیلام گھر" کے آدمی ہیں لیکن مقدس نژاد کا دائرہ عمل بہت وسیع ہے، وہ ہر مجلس، ہر مقام اور ہر تقریب میں نعرہ زن ہوتے ہیں، نعرہ زنی کی کوئی تقریب ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ صرف نعرہ زن ہیں، وہ بہت اچھے مقرر اور مکبّر جمعہ بھی ہیں، نماز جمعہ کے سلسلے میں ان کے ذمے جو کام ہے اس کام کے حوالے سے وہ دنیا کی منفرد شخصیت ہیں۔

تہران میں جمعہ کی نماز صرف ایک جگہ ہوتی ہے اور وہ ہے یونیورسٹی گراؤنڈ ——— جہاں عام لوگوں کے علاوہ فوج، پولیس اور دوسرے سرکاری محکموں کے لوگ بھی نماز ادا کرتے ہیں، امام خمینی کی ملاقات سے ایک روز پہلے اس گراؤنڈ میں ہم حضرتِ مقدس نژاد کے جوہر دیکھ چکے تھے، اس روز امامت کے فرائض جناب علی خامنہ ای صدر اسلامی جمہوریہ ایران نے انجام دیے۔

یونیورسٹی گراؤنڈ کے غربی سرے پہ ایک بلند سٹیج، سٹیج پر کمرہ اور کمرے کی مشرقی دیوار میں دروازہ نما کھڑکی ہے، خطیب جمعہ اسی کھڑکی میں کھڑے ہو کر لوگوں سے ہمکلام ہوتے ہیں، صدر جمہوریہ ایران علی خامنہ ای تقریر کے بعد نیچے آئے تو امامت کے لئے انہیں سطح زمین سے مزید نیچے اترنا پڑا، وہ پختہ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اتنے نیچے گئے کہ ان کا سر سطح زمین کے برابر ہو گیا اور ان کے سر کے چاروں طرف مسلّح پاسدار گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے، نماز شروع ہونے سے چند لمحے پیشتر ایک پاسدار نے امام کے سامنے بنے ہوئے سنگی طاقچے میں سورۃ جمعہ اور سورۃ منافقون کا فریم رکھ دیا تاکہ امام محترم نماز میں تلاوت کر سکیں۔

اس کے بعد جو دیکھا تو مقدس نژاد مائیک ہاتھ میں لئے اور رُخ نمازیوں کی طرف کیے اسی کمرے کی کھڑکی میں کھڑے نظر آئے، ان کے منہ سے لفظ "تکبیر" نکلتے ہی امام اور مقتدیوں نے نماز کی نیت باندھ لی، پھر خاتمہ نماز تک لوگ ان کی آواز پر متحرک ہوتے

رہے، مقدس نژاد نماز سے باہر رہ کر "مکبّر" کے فرائض انجام دیتے ہیں اور ہدایات بھی زبان پہلوی میں جاری کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب رکوع و سجود اور تشہد کا وقت آتا ہے، وہ "اللہ اکبر" کہنے کے بجائے "رکوع، سجدے" اور "قنوت" کی صدا بلند کرتے ہیں، سلام کا وقت آتا ہے تو امام خمینی اور "امام زمانہ" پر اجتماعی درود کی تلقین کی جاتی ہے، میں نے ایک بار کئی علماء کی موجودگی میں جناب مقدس نژاد سے ان کے ان فرائض کی بابت استفسار کیا تو کہنے لگے، میں ملّا لوگوں کا تنخواہ دار ملازم نہیں، اپنا کاروبار کرتا ہوں، میں نے پوچھا کہ نماز کے وقت آپ جماعت سے باہر ہوتے ہیں، اپنی نماز کب ادا کرتے ہیں، کہنے لگے ـــــ میں نے اپنی نماز اُمّت کی نماز پر قربان کر دی ہے۔

اہل ایران کی انقلابی نماز کا یہ انداز ہمارے لئے بالکل نیا تھا، لیکن ہم نے کوئی گفتگو مناسب نہیں سمجھی، کیونکہ مولانا عبدالقادر آزاد تھوڑی دیر پہلے ہی نمازیوں کے سامنے رکھی ہوئی امام خمینی کی قدآدم تصویر پر اعتراض کر کے اسے سامنے سے ہٹوا چکے تھے اور اہل انتظام نے اس کا بُرا منایا تھا، ہم نہیں چاہتے تھے کہ اختلاف کی دیوی اس تقریب سے مزید قریب آنے میں کامیاب ہو، بھارت کے بریلوی عالم علامہ ارشد القادری نے اس پروگرام میں عدمِ شرکت کا فیصلہ کیا تھا وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہے، نماز جمعہ کے بعد ہم ہوٹل پہنچے تو وہ پہلے ہی اس تقریب دلپزیر کی رُوداد سن چکے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکے

بلبل چہ گفت، گل چہ شنید و صبا چہ کرد

امام خمینی کے ملاقات ہال میں مقدس نژاد نعرہ زن ہوئے تو لا الٰہ الا اللہ خمینی روح اللہ ـــ اللہ واحد، خمینی قائد ـــ اللہ اکبر خمینی رہبر، مرگ بر ضدِ ولایت فقیہ، مرگ بر امریکا، مرگ بر شوروی (روس) مرگ بر اسرائیل، کے نعروں کا طوفان

آگیا "مرگ بر" کے اس "قومی ورد" میں پہلے بہت سے مسلم رہنماؤں کے نام بھی شامل تھے لیکن آج کل صرف عراق کے صدر صدام حسین کا نام لیا جاتا ہے، تازہ پالیسی یہ ہے کہ نعروں میں انتہا سے ابتدا، کی طرف آتے ہوئے نام بتدریج کم کئے جائیں اور زیادہ زور "مرگ برامریکا" پر صرف کیا جائے، کیونکہ فی الحال پوری دنیا پر مرگ مسلّط ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

نعروں کے اس شور میں امام خمینی ایک عقبی دروازے سے اپنے فرزند ارجمند اور ایک معمّر محافظ کے ہمراہ اس طرح نمودار ہوئے، جیسے

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا

ان کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی جو نعروں کی لے پہ گہری ہوتی چلی گئی، پھر جوں جوں نعروں میں زیر و بم آتا رہا، ان کی مسکراہٹ بھی دریا کے اتار چڑھاؤ کا منظر پیش کرتی رہی، ہم نے جس جس انقلابی کو دیکھا، آنکھیں دکھاتے دیکھا، لیکن اب اس انقلابی کو پایا تو آنکھیں چھپاتے پایا، ان کی آنکھ نے سب کو دیکھا، ان کی آنکھ کو کسی نے نہیں دیکھا، وہ آنکھیں اٹھائے اور ملائے بغیر بات کرتے ہیں، یہ ان کا انداز ہے، تصویر میں جو آنکھ نظر آتی ہے، وہ مصور کی دستکاری ہے، تاہم تقریر و گفتگو کے دوران وہ ہاتھوں سے بہت کام لیتے ہیں، ان کے فضا میں لہراتے ہاتھوں کی مخصوص حرکت اپنی قوم کے دل کو گرماتی اور روح کو جلا دیتی ہے، بعض ماہرین روحانیات کے نزدیک یہ انداز ان کے روحانی عمل کا حصہ ہے، وہ ایک خاص ڈھنگ سے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھاتے فضا میں لہراتے، پھر دوسرے ہاتھ کو اس کے ساتھ ملاتے اور دونوں ہاتھوں کو اس انداز میں آہستہ آہستہ حرکت دیتے ہیں کہ دیکھنے والے اپنی توجہ انہی کی طرف مبذول کر لیتے ہیں، تقریر و گفتگو سے پہلے اور بعد اس عمل کو لازماً دُھرایا جاتا ہے، خاتمۂ کلام پر سیدھے ہاتھ کو زیادہ استعمال کرتے ہیں، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس ہاتھ کو جیسے کی

جیب سے نکال کر عوام کے سامنے لاتے، چاروں طرف گھوم کر حرکت دیتے اور پھر انتہائی سرعت کے ساتھ اس ہاتھ کو واپس پہلو میں لے جاتے ہیں، چند سیکنڈ بعد دوبارہ دونوں ہاتھ اٹھاتے، سامعین کو دکھاتے اور واپس چلے جاتے ہیں۔

اُس وقت ان کے رُو برو بیٹھے لوگ ان کی انگلیوں میں ہوتے ہیں، وہ ان کے دل و دماغ پر قابض ہو کر حسب ضرورت ان سے کام لیتے ہیں، فنِ جادوگری کے جاننے والے اس عمل کو "عمل تسخیر" کا نام دیتے ہیں، ان کے خیال میں اس وقت عامل کی آنکھیں شعلہ بار ہوتی ہیں، اگر غیر عامل ان شعلوں کو دیکھ لے تو بینائی کھو بیٹھے، ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امام خمینی کا یہ عمل ان کی چودہ سالہ گوشہ نشینی اور خلوت گزینی کا حاصل ہے، وہ کہتے ہیں انقلاب ایران میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما تھے وہاں امام خمینی کا "عمل تسخیر خلق" بھی اپنا کام کر رہا تھا، چونکہ ہم علم روحانیات سے کوئی عملی لگاؤ نہیں رکھتے اس لئے اس بارے میں کوئی رائے دینا ممکن نہیں، تاہم اس رائے کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ امام خمینی کے سامعین کو ہم نے خود بھی مسمرائز ہوتے دیکھا ہے امام خمینی نے جو تقریر کی اس کے یہ انقلابی الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔

"ایران آپ کا وطن ہے، آپ کا گھر ہے، آپ کا اپنا وطن، اپنا گھر، اس وطن میں آپ مسافر نہیں، یہ ہمارا اور آپ کا مشترکہ گھر ہے کیونکہ اس گھر میں اسلام کی روشنی ہے، ہم ایک طویل جدوجہد کے بعد یہاں سے طاغوت کی حکمرانی ختم کرنے میں کامیاب ہوئے، سامراج نے ہر جگہ طاغوت کی حکومتیں قائم کر رکھی ہیں، ہم نے ایران کی زمین سے سامراج اور اس کے ایجنٹوں کو نکال دیا ہے مگر آپ کے ہاں سامراج کی حکمرانی قائم ہے طاغوت ڈٹے ہوئے ہیں، اسلام ہم سے اور آپ سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم طاغوت و شیطان کی حکمرانی کو اپنی اجتماعی طاقت سے ختم کر دیں، یہاں سے واپس جانے کے بعد

اگر پہلے ہی ہفتے آپ باطل سے ٹکر نہیں لیتے، مقابلہ نہیں کرتے، قربانی نہیں دیتے قید و بند کے لئے تیار نہیں ہوتے اور خدا کے دشمنوں کے خلاف اپنی جدوجہد کا آغاز نہیں کرتے تو سمجھ لیجیے کہ آپ کا ایمان و اعتقاد ناقص ہے، سامراج کی ایجنٹ طاغوتی حکومتوں کے خلاف آپ کی جدوجہد کے ہم حامی ہیں، ہمارے وسائل آپ کے لئے وقف ہوں گے، آپ کسی حال میں اپنے کو تنہا نہیں پائیں گے۔"

قائد انقلابِ اسلامی کی تقریر دلپذیر کا یہ ایک اقتباس ہے، کہاں پوری تقریر اور اس کے سیاق و سباق، کہاں ایک اقتباس ـــــ؟ مگر جو دعوت، جو پکار، جو للکار اور جو طرزِ پیکار اس اقتباس میں نظر آتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امام خمینی کے دل میں اسلام و عالم اسلام کے لئے کتنی محبت ہے اور طاغوت سے وہ کس قدر نفرت کرتے ہیں۔

امام خمینی تقریر کر کے کھڑے ہوئے تو احتراماً سبھی لوگ کھڑے ہو گئے محبت بھرے دلوں اور ستائش بھری زبانوں نے ہم آہنگ ہو کر نعرہ لگایا ـــــ الٰہی الٰہی حتیٰ ظہور مہدی احفظ لنا الخمینی ـــ اے اللہ جب تک امام مہدی ظاہر نہیں ہوتے امام خمینی کو ہم میں موجود رہنے دے ـــــ النصر للاسلام و الموت للصدام نفدیک یا امام ـــــ "اسلام کے لے مدد اور صدام کے لئے موت ضروری ہے، اے امام ہم تجھ پہ قربان ہو جائیں گے۔"

اہل مجلس نعروں میں اُلجھے تو میں نعروں کے الفاظ و معانی میں کھو گیا، مقبوضہ کشمیر کے ایک نیک دل بزرگ خادم حسین کی آنکھوں پہ امام خمینی اور لب پہ درود پاک تھا نہ جانے ان کے جی میں آئی کہ مجھ بیباک کو بھی شانوں پہ اٹھا کر کہنے لگے امام کو قریب سے دیکھیں اور جی بھر کے دیکھیں، کیا خبر دوبارہ یہ تاریخی لمحات آئیں نہ آئیں، چند ثانیے توقف کے بعد اچانک بولے ـــ امام خمینی کیسے ہیں؟ عرض کیا۔

آسمانِ دیگراست این بر فرازِ آسمان

وہ فارسی کے انگ انگ سے واقف اور ہم ہر آہنگ سے بے خبر! گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے طالب تشریح ہوئے! میں سوچنے لگا دستِ دل سے ان کے درِ دل پہ دستک دوں یا زبانِ روح سے آواز ؟ معلوم ہوا فی الحال اقدام کی ہمت ہے نہ صبر کی تاب! وہ میری فکر مندی کو انکار سمجھ کر اصرار کرنے لگے تو صبر صبر ہوا اور اقدام اقدام — !میری خاموشی کو زبان مل گئی اور نوا کو نوا سنجی، آخر اس جواب سے ان کا اطمینان ہو گیا

حمدِ بے حد مر خدائے پاک را
آنکہ ایماں داد مشتِ خاک را

امام خمینی سے ملاقات کے لمحات میری زندگی کے اہم ترین لمحات تھے، ان لمحات کی بدولت میری سوچ کو زاویہ، نظر کو نور، خیال کو آرائش، تصور کو زیبائش، فکر کو فراست، فہم کو پر اور عقل کو پرواز ملی، قائد ایران کو دیکھا تو قائد پاکستان یاد آگئے، قائد ایران کو ایک منظم قوم ملی ہے، قائد پاکستان کو ایک بکھری ہوئی قوم ملی تھی، قائد ایران تین کروڑ انسانوں کے امام، قائد پاکستان آٹھ کروڑ مسلمانوں کے رہنما، قائد ایران کا شاہ ایران سے مقابلہ، قائدِ پاکستان کی تاج برطانیہ سے جنگ، قائد ایران کے مخالف ایرانی آتش پرست، قائد پاکستان کے مخالف ہندو گوبر پرست، قائد ایران کا آتش کدہ ایران سے واسطہ، قائد پاکستان کا سومنات ہندوستان سے سابقہ، قائد ایران کے انقلاب میں عبرت اور قائد پاکستان کے انقلاب میں ہجرت — خمینی دینی علوم کے فاضل، محمد علی جناح عصری علوم کے ماہر، ایک فقیہہ ایک فیصل، ایک صاحب پند، ایک صاحب پندار ایک دیدہ ایک دیدہ ور، ایک مؤکل، ایک وکیل، ایک زندگی اور ایک حاصل زندگی —— موازنہ مقصود نہیں، کیونکہ اس کی گنجائش ہی نہیں، بات میرے محسوسات کی ہے،

میں نے دیکھا، میں نے سنا، میں نے سوچا، میں نے غور کیا اور میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ابراہام لنکن، ڈیگال، مصطفےٰ کمال، لینن، خروشیف، ہوچی اور ماؤزے تنگ دنیا کے عظیم لوگ تھے مگر قائداعظم محمد علی جناح کی عظمت ان سب سے زیادہ تھی! ان میں سے کوئی رہنما کسی نظریاتی ریاست کا بانی نہیں، محمد علی جناح دنیا کی سب سے بڑی نظریاتی ریاست کے بانی ہیں، یہ سب رہنما نظریات کے تابع اور محمد علی جناح نظریات کا ترجمان، اپنے دور کا سب سے بڑا سیاستدان۔

سوچوں کا سلسلہ ٹوٹا تو لب پہ آئی یہ دعا ان کے تمنا میری
آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ایک بار حکومت برطانیہ نے اپنے عبقری قلمکار بیورلی کو محمد علی سے ہمکلام ہونے پر مامور کیا، برطانوی حکمرانوں کا خیال تھا کہ محمد علی بیورلی کے منہ زور سوالات کا جواب نہیں دے سکیں گے لیکن

خود آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

بیورلی کو اپنی حاضر دماغی پہ ناز اور محمد علی یکسر بے نیاز ــــ ملاقات ختم ہوئی تو بیورلی حیران رہ گیا، کیونکہ محمد علی نے اس کے منہ زور سوالوں کا منہ توڑ جواب ہی نہیں دیا تھا، وہ اس کے دل و دماغ پر بھی قابض ہو چکے تھے۔ جانتے ہیں بیورلی نے اپنی کتاب "آئینہ ہند" (VERDICT ON INDIA) میں اس ملاقات کو کیا عنوان دیا ہے؟ "فوق البشر سے ملاقات"!

محمد علی جناح فوق البشر نہیں، غلامِ خیر البشر تھے، مطلق بشر تھے، لیکن بیورلی انہیں فوق البشر کہنے پر مجبور ہے، وہ اس عنوان کے تحت لکھتا ہے:-

"۶۷ سالہ سرو قد، دبلے پتلے، خوب صورت اور خوش لباس محمد علی جناح سے ملیے!

یہ ایشیا کے ایسے عظیم رہنما ہیں، جنہیں دیکھ کر آپ اٹھارویں صدی کے شہزادوں کو بھول جائینگے
میں نے ان کے لئے ایشیا کی عظیم ترین شخصیت کے الفاظ استعمال کئے ہیں تاکہ آپ پر
ان کے خیالات کی اہمیت واضح ہو سکے، اگرچہ عظمتوں کی افضلیت کا تعین بہت دشوار
چیز ہے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جناب جناح کو میں نے ایشیا کا مدبر اعظم کہتے
ہوئے مبالغے سے کام نہیں لیا۔

آنے والے چند برسوں میں ہندوستان کا مسئلہ سرفہرست رہے گا اور ہندوستان
کا نام آتے ہی جناب جناح کی کلیدی اہمیت اور منفرد سیاسی حیثیت کا ذکر لازماً آئے
گا، اس لئے ان کے مقام و مرتبے کا شعوری احترام لازم ہے، وہ جس طرف چاہیں جنگ
کا رُخ پھیر سکتے ہیں، ہندوستان کے "دس کروڑ" مسلمان ایک منظم فوج کی طرح ان کے
اشاروں پر آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلیں گے، —— یقین کیجئے کہ مسلمان صرف جناح
کے اشارے پر چلیں گے کسی اور کے اشارے پر ہرگز نہیں چلیں گے —— ہندوؤں کا
معاملہ مختلف ہے، ان میں گاندھی نہ ہو تو نہرو ہے، راجگوپال اچاریہ ہے، پٹیل ہے، دیگر
درجنوں رہنما ہیں مگر مسلمانوں میں محمد علی جناح تنہا ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں۔"

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

محمد علی جناح اور بیورلی نکلس کی ملاقات میں برصغیر کی سیاست کے بہت سے عنوان
زیر بحث آئے، مدتیں گزرنے کے بعد بھی اس گفتگو کی تازگی، لذت، حلاوت اور شیرینی میں
کمی نہیں آئی، صرف دو سوال اور دو جواب سنیئے اور سر دھنیئے!

بیورلی ۔ آپ کے نکتہ چیں تو یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کا تصور بھی انگریزوں کی
تخلیق ہے، وہ اس طرح نہایت عقلمندی سے "تقسیم سے حکومت کرو" کی حکمت عملی کو
وسعت دے رہے ہیں۔"

محمد علیؒ — لیجیے! یہ لوگ میری نیت پر شک کرنے کے علاوہ انگریزوں کو بھی بالکل

اپنے جیسا بدھو سمجھتے ہیں، انگریزی حکومت کی بقاء کا تو انحصار ہی متحدہ ہندوستان کے تصور کی تبلیغ پر ہے، گاندھی جی تو بلاوجہ اس تصور کے پرچارک بنے بیٹھے ہیں — ایک بار اور سنیئے کہ متحدہ ہندوستان برصغیر میں انگریزی حکومت کی توسیعی حدود کا مظہر ہے، سیاسی طور پر یہ ایک سراب ہے، ایک خطرناک اور لامحدود فریب نظر ہے، اہل ہند جب تک اس تصور سے چمٹے رہیں گے، برطانیہ کو حکمرانی کا بہانہ فراہم ہوتا رہے گا۔

بیورلی۔ تو گویا آپ کا مطالبہ ہے کہ تقسیم کرو اور گھر جاؤ؟

محمد علی — بالکل!

میرا خیال ہے، قائد کی بات مجھے موضوع سے دور لے گئی، اس وقت موضوعِ سخن قائد پاکستان نہیں، انقلاب ایران ہے، لیکن انقلاب ایران سے پہلے تاریخ انقلاب پر بات کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی
دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا

روئے زمین پر پہلا انقلاب قابیل کے ہاتھوں ہابیل کا قتل تھا، اس کے بعد ہر انقلاب کے شگوفے ظلم کی اسی شاخ سے پھوٹے — سوائے اس انقلاب کے جو کسی نبی کے ہاتھوں تکمیل کو پہنچا، اس سلسلے کا سب سے بڑا اور آخری انقلاب پیغمبر اسلام کا برپا کردہ اسلامی انقلاب تھا، اس انقلاب کی لہریں آج بھی دنیا کے مختلف حصوں میں کروٹ لے رہی ہیں۔

فی زمانہ مسلم دنیا میں جہاں کہیں سیاسی تبدیلی آتی ہے، اسے بالعموم اسلامی انقلاب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر اس انقلاب کے خط و خال براہیمی نہیں، آزری ہوتے ہیں، مسلم دنیا کی اس کوشش کو ہم اسلامی انقلاب کی تڑپ یا جستجو تو کہہ سکتے ہیں، لیکن کسی ملک میں آنے والی اس طرز کی تبدیلی کو اسلامی انقلاب قرار دینا بڑا وقت طلب مسئلہ ہے

کیونکہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت کے بعد اسلامی انقلاب کی حقیقی تصویر کہیں نظر نہیں آتی۔

تاریخ ہمیں جو کچھ بتاتی ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انقلابِ اسلامی کے آثار سلاطین وملوک نے دوسری صدی ہجری میں ہی مٹانے شروع کر دیئے تھے، ان حکمرانوں کی سیرت وکردار میں عیش و طرب نے جو انقلاب بر پا کیا تھا، وہ انقلاب اسلامی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا، اُس وقت سے لیکر اب تک ایک تعطّل اور جمود قائم ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج مُسلم دنیا کے کسی گوشے میں نہ صرف یہ کہ اِسلامی انقلاب موجود نہیں، بلکہ اُس کے اثرات اور ثمرات بھی غائب ہو چکے ہیں، ایک طویل تاریخی جمود کے بعد ایران میں اسلامی انقلاب کے نام پر جو تازہ تبدیلی آئی ہے وہ بہر حال توجہ طلب ہے اور اُسے نقد ونظر کے ترازو میں بھی تولا جا سکتا ہے۔

مجرد انقلاب کے نقطۂ نظر سے ایران کا سینہ ایک ایسا سفینہ ہے، جس میں انقلابِ زمانہ کے ہزاروں قافلے سفر کر چکے ہیں، صدیاں تھکتے تھکتے گزریں، قافلے لُٹتے پِٹتے سفر ہوئے، انقلاب آئے اور پے در پے آئے، اس کا سینہ تھکا نہ سفینہ ٹوٹا اور نہ ہی قافلوں کے دم خم میں فرق آیا، تاہم ان تمام انقلابی قافلوں میں رہنما قافلہ یہی ہے جو تازہ انقلاب کا بانی قرار پایا ہے، کسی کو اس کی رہنمائی کا اعتراف ہو نہ ہو، ہم مشاہدے کی منزل سے گزر کر اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

ایران کا موجودہ انقلابی گروہ اپنے حُجم کے اعتبار سے اگرچہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا مگر طاقت کے استعمال اور اپنے بر پا کردہ انقلاب کے نتائج وثمرات کے لحاظ سے یہ قافلہ رُوس، فرانس اور چین کے تین تاریخی اور انقلابی گروہوں سے زیادہ مؤثر، متحرک، فعال اور سخت گیر ہے، ان تاریخی قافلوں کے عمل کو تاریخ نے سخت گیری کا نام دیا ہے مگر ہم ایران کے قافلۂ انقلاب کے کردار وعمل کو "دست گیری" کا نام دیتے ہیں، بات

یہ نہیں کہ ماضی میں لوگ خِرد کو جنوں کہتے تھے اور اب جُنوں کو خِرد کہنے لگے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ ایران کی انقلابی تنظیم کا عمل ابھی مکمل نہیں ہوا، کتابِ انقلاب کا ایک ورق سامنے آیا ہے، دوسرا ورق سامنے آنے میں کچھ دیر ہے

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہوتے تک

خمینی کا ایران ماضی میں شہر یاروں کا دیس اور ماہ پاروں کا مسکن تھا، حال ماضی سے قدرے مختلف ہے، اب شہر ہیں، شہر یار نہیں، کوچہ و بازار ہیں، ان میں پہلے سے اسرار نہیں، حالات نے کروٹ لی تو نقشہ بدل گیا، جہاں ظلُّ اللہ اُڑے پھرتے تھے، وہاں آیت اللہ فرد کش ہیں، جہاں حسن و شباب کی رنگینیاں تھیں، وہاں پاسدارانِ انقلاب کی سنگینیاں ہیں، کیونکہ انقلاب بہرحال انقلاب ہے!

انقلاب آتا ہے تو اپنے ساتھ کئی طوفان لاتا ہے، اس کے تیور خطرناک اور تہور طربناک ہوتے ہیں، اس کی ہیبت ڈراتی ہے تو اس کا شکوہ لرزہ براندام کر دیتا ہے، اس کے انداز میں دہشت اور اطوار میں وحشت ہوتی ہے، اس کی اُٹھان اجل، رفتار قیامت اور اس کیساتھ چلنا قیامت در قیامت ــــــــ کوئی اس کا ساتھ دیتا ہے تو ٹھیک نہیں دیتا تو اس کی طاقت ہر ایک کو ساتھ دینے پر مجبور کر دیتی ہے، اس کا تُند و تیز ریلا اتنا سرکش و صبا رفتار ہوتا ہے کہ ہر ساکن و متحرک شئے کو اپنے بہاؤ میں بہا لیجاتا ہے، پُرانی قدریں مٹا دی جاتی ہیں اور نئے خطوط ابھارے جاتے ہیں، یہ دیکھے یا سوچے بغیر کہ پہلے خطوط میں کیا خرابی تھی اور نئے خطوط میں کونسی خوبی ہے!؟

انقلاب جب بھی آتا ہے اور جہاں بھی آتا ہے اس کے عمومی خط و خال ایسے ہی ہوتے ہیں، لیکن اہل نظر کو تسلیم کرنا چاہیے کہ انقلابِ ایران آغاز میں دنیا کے ہر انقلاب سے مختلف تھا، اس کی پُشت پر ایک طرف حوزۂ علمیہ کے فیض یافتہ علماء تھے اور دوسری طرف "اشبل وزہرات" کے تربیت یافتہ نوجوان، ایک محاذ پر دینی علوم کے ماہر اور دوسرے

مورچے پر عصری علوم کے سر بہ فلک پہاڑ — جی ہاں! دیکھنے اور سننے کی حد تک یہ سب کچھ تھا۔

"اشبل" اور "زہرات" کے الفاظ بیشتر لوگوں کے لئے غیر مانوس ہوں گے، عربی میں "شبل" شیر کے بچے کو کہتے ہیں۔ "زہرات" کا استعارہ واضح ہے، یعنی شیروں کے بیٹے اور پھولوں کی بیٹیاں یا نوخیز شیر اور نوشگفتہ کلیاں! اس معنوی پس منظر میں زمینِ فلسطین پر دو مقامات کے دو نام اور دونوں تنظیم آزادیٔ فلسطین جارج حبش گروپ کے تربیتی کیمپ!

ان کیمپوں میں روسی ماہرینِ حرب و ضرب کے زیر نگرانی اُن ملکوں کے لئے سنگ و آہن ڈھالے جاتے ہیں جو روس کے زیر اثر رہنے کے لئے کسی معاہدے کے پابند ہوتے ہیں، شاہ کے دورِ حکومت میں جس تحریک کے برگ و بار نکلے، اس کے زیر اثر نوجوان "اشبل و زہرات" کے انہی کیمپوں میں تربیت پاتے تھے، ان نوجوانوں کو فنی تربیت کے ساتھ دینی حمیت بھی سکھائی گئی، جس سے ان کا جسم فولادی، روح سجادی اور دل حدادی بن گیا، انقلاب کے بعد جب میدان علماء کے ہاتھ آیا تو یہ نوجوان "پاسبانِ انقلاب" کی صورت میں سامنے آئے۔

یہی وجہ ہے کہ انقلابِ ایران کا ظہور ہوا تو معجزانہ طور پر بُرے خطوط مٹتے نظر آئے اور اچھی علامات اُبھرتی دکھائی دیں۔ شاہی یادگاروں کا نظروں سے اوجھل ہونا انقلاب کے نقطۂ نظر سے بدی کا خاتمہ تھا اور علمی و نظری افراد کی جلوہ گری، نیکی و سلامتی کی جانب انقلابی پیش رفت —— مگر اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دیا جائے کہ معجزات کی عمر ہمیشہ مختصر رہی ہے، یہاں بھی یہی ہوا۔

ہم حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے قائدینِ انقلاب کی اس تاویل کو قبول کر لیتے ہیں کہ امام خمینی کی جد و جہد فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوئی تو تربیت یافتہ گروہ کے ساتھ غیر تربیت یافتہ لوگ بھی آملے تھے، یہ ایک غنیم تھا جو مالِ غنیمت میں حصّہ

طلبی کی غرض سے آیا تھا، اچھے اور بُرے افراد یکجا ہوئے تو ماحول آہستہ آہستہ دھندلاتا چلا گیا اور اس طرح بعض معاملات گڈ مڈ ہو گئے۔ قائدینِ انقلاب کی یہ بات دُرست ہے مگر ہماری یہ بات بھی غلط نہیں کہ انقلاب جیسی حقیقت کو فکری و نظری فلسفے کے بجائے کتابِ تاویلات، کے حوالوں سے سمجھانا عقل و منطق کے خلاف ایسی انوکھی جنگ ہے، جسے آج تک کوئی نام نہیں دیا جا سکا، اگر دیا ہے تو کم از کم ہمارے علم میں نہیں، کوئی قوم چند افرادِ قوم کی ذاتی نیکیوں سے مخلوق خدا کے اُجڑے دلوں، افلاس زدہ چہروں اور تاریک آنگنوں کو روشن نہیں کر سکتی، بقول حضرت سعدی،

ہزار گنج قناعت ہزار گنج کرم ہزار طاعت شب ہا ہزار بیداری

ہزار روزہ و ہر روز دہ ہزار نماز قبول نیست اگر خاطرے بیازاری

انقلابِ ایران کے آغاز اور موجودہ رُوئے دلنواز پر جب کوئی مُبصر نظر ڈالتا ہے تو اسے ایک عجیب سی الجھن گھیر لیتی ہے، کیونکہ اسے گزشتہ اور موجودہ صورت حال میں کوئی مطابقت نظر نہیں آتی، تہران کانفرنس کے دوران ہم نے بعض مبصرینِ عالم کی زبان سے یہ تبصرہ بھی سُنا کہ "ایران کا انقلاب پہلے اسلامی تھا، اب انتقامی ہے" مگر ہم سُوءِ ظن کے قائل نہیں، اس لئے اسے ہنوز انتقامی انقلاب کہتے ہیں۔

انقلاب ایران کی پہلی اور دوسری تصویر میں فرق اور فاصلہ ہے، اس کا دوسرا دور پہلے سے مختلف اور پہلا دوسرے سے جدا ہے، اس لئے کچھ اہل فکر اس کے دورِ اوّل پر حیران تھے تو کچھ اہلِ نظر اس کے دورِ ثانی پر پریشان ہیں، مدبرینِ عالم کی ایک جماعت کے لئے اس کے ابتدائی معجزانہ اثرات باعثِ استعجاب تھے تو مبصرینِ جہاں کے ایک دوسرے گروہ کے لئے اس کے بعض موجودہ ناقابل فہم نتائج وجۂ اضطراب ہیں، اربابِ بصیرت کی سوچ کی ایک انتہا وہ تھی، ایک یہ ہے، جب کہ حقیقت اِن دونوں کے درمیان ہے۔

مگر اس حقیقت تک رسائی کے لئے نہ تو مغربی ذرائع ابلاغ کی اطلاعات مفید ہو سکتی ہیں اور نہ ہی انقلابی حکومت کے اہلکاروں کا تیار کردہ پالیسی میٹر روشنی کی کوئی کرن دکھا سکتا ہے، جب تک روشنی کی کرن ظاہر نہیں ہوتی، یہ جاننا بہت مشکل ہے کہ ایران کا انقلاب محض انقلاب ہے یا اسلامی انقلاب ؟ یہ گتھی اب تک سلجھ نہیں پائی، وجہ ظاہر ہے کہ اہلِ نظر ہر انقلاب کو شخصیّات کے حوالے سے دیکھنے کے عادی ہیں دیانت اور بصیرت کا تقاضا یہ ہے کہ کسی انقلاب کو افراد کے کردار سے نہ پرکھا جائے افراد تو خواب و خیال کی طرح فانی اور آبِ جُو کی طرح آنی جانی چیز ہوتے ہیں، نظریات جیسی مستقل حقیقت کو افراد جیسی غیر مستقل مخلوق کے حوالے سے پرکھنا ایک لطیفہ تو ہو سکتا ہے مگر کوئی فکری فلسفہ ہرگز نہیں، یہ ٹھیک ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے مگر بہت سے اچھے درختوں کے پھل موسمی اثرات کی تباہ کاریوں سے سڑ جاتے ہیں مگر نہ تو ان درختوں کی اصلیت مشکوک ہوتی ہے اور نہ ہی انہیں اکھاڑ پھینکنے پر دلائل دیئے جاتے ہیں۔

انقلابِ ایران کو جن شخصیات کے حوالے سے پرکھا جاتا ہے وہ تو ایک تلمیح ہیں، اگر اپنے خیالات کے زور پر شخصیات کی عظمت کو بڑھانا یا گھٹانا ممکن ہوتا تو یہ اندازِ فکر بجا تھا، لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ شخصیات کے کردار کو مٹانے یا اُجاگر کرنے میں واقعات اور ان کے نتائج کارفرما ہوتے ہیں، اگر ان واقعات کو نظرانداز کر کے محض شخصیات کے حوالے سے حالات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا، انقلابِ ایران کی پُشت پر فی الوقت ہمیں جو شخصیات نظر آتی ہیں ان کے چہروں کو دیکھ کر راہوارِ خیال دوڑاتے ہوئے شاعری تو کی جا سکتی ہے، لیکن سیاسی تجزیہ نہیں کیا جا سکتا، کوئی شخص سیاسی تجزیہ کرنا چاہے تو اسے شخصیات کے بجائے واقعات کو دیکھنا ہوگا۔ شخصیات کے چہروں پر حالات کے ایسے خول چڑھے ہوئے ہیں، جو آئے دن

بدلتے رہتے ہیں۔

کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسٹر بنی صدر کو قوم نے صدر منتخب کیا تھا؟ —— آپ کا جواب یقیناً اثبات میں ہوگا مگر اس سے کہیں بڑی حقیقت یہ ہے کہ قوم کے اسی صدر کو حالات نے غدار قرار دے کر ترکِ وطن پر مجبور کر دیا ہے —— حالات کا ایک خول وہ تھا جس میں بنی صدر محبوب ملّت نظر آتے تھے، دوسرا خول یہ ہے کہ آج وہی بنی صدر مغضوبِ ملّت بنے ہوئے ہیں، کل انہیں بنی صدر کہا جاتا تھا، آج انہیں بنی در کہا جاتا ہے، اگر ان کی ذات کے حوالے سے انقلابِ ایران اسلامی تھا تو اب ان کی ذات کے حوالے سے وہ اسلامی نہیں رہا —— ! مسٹر بنی صدر یا تو پہلے بھی غدار تھے، جب انہیں اعتماد کا ووٹ دیا گیا تھا یا اب بھی وفادار ہیں جب انہیں غدار قرار دیا جا چکا ہے، یا تو قوم کی اکثریت کا وہ فیصلہ درست نہیں تھا کہ انہیں صدر بنایا، یا پھر موجودہ اقدام غلط ہے، جس کے تحت انہیں غدار قرار دے کر جلا وطنی پر مجبور کر دیا گیا، ان دونوں باتوں میں سے ایک بات درُست ہو سکتی ہے، ایک وقت میں دونوں باتیں کسی منطق کی رُو سے دُرست نہیں ہو سکتیں۔

"کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ جناب قطب زادہ ایران کے منتخب وزیر خارجہ تھے؟ آپ یقیناً اس بات کی صداقت سے بھی انکار نہیں کریں گے لیکن اس صداقت سے اہم واقعہ یہ ہے کہ انقلابی حکومت نے قطب زادہ کو غداری کے الزام میں سزائے موت دیدی ہے —— حالات کے پہلے خول نے انہیں وزیر بنایا تھا، دوسرے نے اسیر بنایا، تاآنکہ دستِ جلاّد نے انہیں ایک ہی وار میں حکومت کی گود سے کھینچ کر زمین کی آغوش میں دیدیا —— ! کون جانے آنے والا وقت کس کے گلے میں غداری کا طوق ڈالتا ہے اور کس کس کو سندِ وفاداری سے سرفراز کرتا ہے؟ ایک وقت وہ تھا کہ آیت اللہ شریعت مداری ایران کے سب سے بڑے

دینی و رُوحانی رہنما تھے، ان سے ملنا سعادت، ان کی زیارت کرنا عبادت اور ان سے فیض حاصل کرنا ثقاہت سمجھا جاتا تھا، اب ایک وقت یہ ہے کہ ان کے لاکھوں پیرُو کار ان کی صورت کو ترستے ہیں، انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کا مذہبی پیشوا کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ پہلے ان سے ملنا ثواب سمجھا جاتا تھا، اب یہی ثواب عذاب کا مترادف بن گیا ہے، پھر یہ رویّہ اور یہ خیال کتنا عجیب ہے کہ انقلابِ ایران کو حالات کے بجائے شخصیات کے حوالے سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، ہمارے خیال میں اس انقلاب کو شخصیات کے حوالے سے جانچنے اور پرکھنے کے بجائے قوم کے جذبات، احساسات اور خدمات کے حوالے سے دیکھنا زیادہ مناسب ہوگا!

کوئی شبہ نہیں کہ ایران کے اکثر عوام اسلام، ایمان اور قرآن کے دلدادہ ہیں، وہ پہلے بھی اسلام سے محبت کرتے تھے، اب بھی اسلام چاہتے ہیں، ایران کا موجودہ انقلاب انہی عوام کی کوششوں، کاوشوں اور قربانیوں کا ثمر ہے، ایرانی عوام شاہ سے اس لئے متنفر ہوئے کہ وہ دنیادار تھا اور علماء سے اس لئے متأثر ہوئے کہ وہ دین دار تھے، درحقیقت یہ لوگ اپنے ایمان و اخلاص اور جذبے سے متأثر تھے، کسی مولوی یا فقیہہ سے متأثر نہیں تھے، مولوی اور عالم چونکہ انہیں اپنے جذبۂ ایمان کی عملی تصویر نظر آتے تھے اس لئے یہ لوگ ان کے پیچھے چل پڑے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایرانی عوام کا یہ مُجاہدانہ سفر کسی قائد کی پیروی میں نہیں تھا، اپنے ایمان اور جذبے کی پیروی میں تھا، ان عوام کی شاہ سے دشمنی اور علماء سے دوستی ہرگز نہیں تھی، انہیں اس بات سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ شاہ تخت خالی کرکے جائے گا تو اس کے خالی تخت پر آکر بیٹھنے والا کون ہوگا، انہیں تو صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ اس تخت سے جو فیصلے جاری ہوں گے وہ خدا کے احکامات اور نبی کے ارشادات کے مطابق ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کی یہ خواہش کیوں تھی؟ اس کا معروف جواب

تو یہ ہے کہ وہ مسلمان تھے اور ہر مسلمان کو اسلام سے محبت ہوتی ہے مگر یہ جواب بہت کمزور، بہت بودا، بہت غیر منطقی اور بہت ہی غیر معقول ہے!

اصل بات یہ ہے کہ مسلمان بھی دوسرے انسانوں کی طرح گوشت پوست کے انسان ہیں، ان کے جسم و جاں کے بھی وہی تقاضے ہیں جو ہر انسان کے ہوتے ہیں، یا ہو سکتے ہیں، ان مسلمانوں کو مسجدوں، خانقاہوں اور درس گاہوں میں بتایا جاتا ہے کہ اسلام تمہارے حقوق کا علمبردار ہے، وہ تمہیں ایسے تمام حقوق چھین کر دینے کا دعویدار ہے جو بادشاہوں نے اپنی طاقت کے بل بوتے پر تم سے غصب کر رکھے ہیں اگر انقلاب ایران سے پہلے واقعات کو ذہن میں تازہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو علماء انقلاب کا ہراول دستہ تھے، انہوں نے اسلام کے حوالے سے عوام کے حقوق کی بات کی تھی، ورنہ جہاں تک اسلام کی صداقت اور اس پر کسی حد تک عمل پیرا ہونے کا تعلق ہے، یہ دونوں چیزیں تو پہلے بھی موجود تھیں اور خود شاہ کی زندگی بھی ان سے یکسر خالی نہیں تھی۔

کوئی شبہ نہیں کہ اسلام کی بالادستی، عدل اسلامی کی حاکمیت، اسلام کے عطا کردہ حقوق اور اس کے متعین کردہ فرائض ایسی چیزیں ہیں جنہیں عوام انقلاب سے پہلے بھی چاہتے تھے اب بھی چاہتے ہیں، ایران کے عوام آج بھی اس جذبے سے سرشار ہیں اور ان کے اس جذبے کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی انقلاب کی تڑپ ان میں پہلے بھی موجود تھی، اب بھی موجود ہے۔

ایرانی عوام کی خواہشات، جذبات اور احساسات کے نقطۂ نظر سے موجودہ انقلاب کی بنیادیں واقعتاً مثبت ہیں، اس کی زندہ مثال ایران کی نوجوان نسل ہے جو اپنے ماضی کو بھول چکی ہے یا بھول جانا چاہتی ہے، ہم نے جس "گون بکف" نسل کا مشاہدہ کیا ہے اس میں کچھ قانیہ ردیفیت بھی ہیں لیکن بعض جلی و خفی مشاہدات کو نظرانداز کر دیا جائے تو مجموعی طور پر یہ نسل پچھلی تمام نسلوں سے بہتر ثابت ہو سکتی ہے۔ اس نئی پود پر اسلام کے اثرات غالب ہیں۔

شاہی ایران کے جو نوجوان عیاشی کے دلدادہ تھے، موجودہ انقلاب کے بعد ان کی سیرت و بصیرت میں خوشگوار انقلاب آیا ہے، ان نوجوانوں کے سینوں میں حقائق کے اسرار اور جبینوں پہ سجدوں کے آثار ہیں، ایرانِ جدید کا حقیقی سرمایہ یہی نوجوان ہیں جنہوں نے ذہن سے بیگانے ماضی کو ترک کر کے ایک سُہانے حال کو قبول کیا ہے۔

ان نوجوانوں پہ نہ تو روس کے بطنی فلسفے کے آثار ہیں اور نہ ہی امریکہ کی لیلائے جمہوریت کے ——— ان کا کردار و عمل ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کا ضامن بن سکتا ہے لیکن اس طرف توجہ ہی نہیں دی گئی، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو فکری انقلاب آیا ہے وہ اس انقلاب سے بڑا ہے جس کی نمائش پہ کروڑوں روپے خرچ کئے جا رہے ہیں، یہ انقلاب صرف اور صرف اسلام کے معجزانہ اثرات کا کرشمہ ہے اور یہ ایک ایسی صداقت ہے جس کو جھٹلانا سفید کو سیاہ کہنے کی جسارت ہے، لیکن حالات کا جو نقشہ اب بن رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انقلابی قیادت کے عاجلانہ فیصلے ان نوجوانوں کو راہِ منزل سے ہٹا دیں گے، جو نوجوان ماضی میں شاہ سے برسرِ پیکار تھے، مستقبل انہیں قائدین انقلاب کے مقابلے میں کھڑا کر دے گا، جو نوجوان آج "مرگ بر امریکا" کا راگ الاپ رہے ہیں آنے والا وقت انہیں اپنے بیگانے سے ناآشنا کر دے گا اور ان کی یہ غالب قوت غالب کی ہمزباں ہو جائے گی

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

شاہ اور خمینی کے دور کو ہم پھول اور ببول سے تشبیہہ دے سکتے ہیں، پھول ماحول کو زیب، مناظر کو زینت، چمن کو حسن، موسم کو دلفریبی، فطرت کو رعنائی، کائنات کو رنگینی، صبا کو خوشبو، فضا کو اجالا، ویرانے کو رونق، عندلیب کو سوز، آنکھ کو مُسرت، دِل کو فرحت، روح کو سرور، اور وجدان کو کیف دیتا ہے مگر ببول؟ بے مقصد، بے مصرف، نہ سوختنی نہ فروختنی۔

بہار کی قسمت میں پھول آئے، خزاں کے مقدر میں حسرت و یاس ـــــ سدا بہار محاورہ ہے، حقیقت نہیں، حقیقت آب اور محاورہ سراب ہے، زندگی فرد کی ہو یا قوم کی، قسمت کی تابع ہوتی ہے۔ قسمت اس پہ اپنی عنایات کی بارش تو کرتی ہے مگر مسلسل نہیں، اس کی تقسیم ایک ہاتھ سے ہوتی ہے دونوں سے ہرگز نہیں ـــــ! یہ غریب کو معدہ دیتی ہے خوراک نہیں دیتی، امیر کو خوراک مہیا کرتی ہے تو معدے سے محروم کر دیتی ہے، کسی کے حصے میں علم آتا ہے، کسی کے کشکول میں دولت اور کسی کے مقدر میں صلاحیت ـــــ قانونِ قسمت تینوں کو جمع نہیں ہونے دیتا، شاہ کا دور لد گیا، انقلاب کی بہار جوبن پر ہے، ایک دورِ ماضی، ایک دورِ حاضر، دو عہد، دو دور اور دو زمانے، آمنے سامنے، ایک دانائے بے علم اور ایک عالم بے دانش۔

ایک سوال ہے سیدھا سادا سوال!

کیا انقلابِ ایران شاہ کے جانے، خمینی کے آنے اور علماء کے چاہنے سے آیا؟

ہرگز نہیں! ـــــ ہم جس انقلاب کو تاریخ کی صداقت کا نام دیتے ہیں، وہ کسی امام، کسی مجتہد، کسی عالم، کسی فقیہہ، کسی مولوی یا کسی دوسری شخصیت کی کوششوں کا مرہونِ منت نہیں ـــــ یہ تو ایک بات ہے کہ انقلاب کے بانی امام خمینی ہیں، یہ تو ایک قول ہے کہ انقلاب کی قیادت علماء کے ہاتھ میں تھی! اب سوال کو الٹ دیجئے اور یہ فرمایئے کہ اگر شاہ نہ جاتا تو انقلاب آتا؟ امام خمینی نہ ہوتے تو انقلاب برپا ہوتا؟ علماء نہ ہوتے تو دنیا اس انقلاب سے آشنا ہوتی؟

جو لوگ تاریخِ انقلاب سے بے خبر ہیں، ان کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا مگر تاریخِ انقلاب پہ جن لوگوں کی نظر ہے، وہ بلا تردد کہہ سکتے ہیں کہ اگر شاہ نہ جاتا تو انقلاب جب بھی آتا، اگر خمینی موجود نہ ہوتے انقلاب تب بھی ناگزیر تھا، اگر علماء کی قوت و قیادت موجود نہ ہوتی انقلاب کا راستہ پھر بھی کھلا تھا ـــــ کیونکہ انقلاب ایک تاریخی عمل ہے، تاریخی عمل افراد کا محتاج

نہیں ہوتا، افراد تاریخی عمل کے محتاج ہوتے ہیں، تاریخ کا عمل افراد کے ساتھ سفر نہیں کرتا، افراد اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں، اس عمل کے دوران جن افراد کو معاشرے کی مدد حاصل ہوتی ہے، وہ اُبھر کر سامنے آجاتے ہیں، جو مدد سے محروم رہتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے ڈوب جاتے ہیں

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

ہم ایران کے ماضی و حال کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ——— شاہ کا دور ——— امام خمینی کا عہد ——— ایک حالت وہ تھی، ایک یہ ہے ——— کیا ہم پہلی حالت کو شاہ کا انقلاب کہہ سکتے ہیں ؟ اگر نہیں تو پھر دوسری حالت کو کس منطق کے زور سے انقلاب کا نام دیا جا سکتا ہے ؟ لغوی معنوں میں آپ تبدیلی کو انقلاب کہدیں مگر اصلاً شاہ کی ذات کے حوالے سے شاہ کا دور، دورِ انقلاب تھا، نہ امام کا عہد، عہدِ انقلاب ہے ۔

انقلاب تو اس کیفیت کا نام ہے جو افرادِ معاشرہ کے ذاتی، اجتماعی، معاشی و معاشرتی ضروریات اور مذہبی رُجحانات کے حوالے سے جنم لیتی ہے اور پھر یہی کیفیت عمل کا رُوپ دھار کر مخالف کو چاروں شانے چت کر دیتی ہے، اس لحاظ سے ہم انقلابِ ایران کو ایک ردِ عمل بھی کہہ سکتے ہیں، شاہ کے ابتدائی دور میں عوام کی خواہشات زمانۂ آخر سے مختلف تھیں، آغاز میں مسائل کم تھے اور آخر میں زیادہ ——— لوگوں کے مسائل بڑھے تو خواہشات بھی بڑھ گییں، شاہ نے مسائل کے طوفان کو روکنے کی کوشش نہ کی تو نفرت و انتقام کا طوفان کھڑا ہو گیا، شاہ عوامی امداد سے محرومی کے باعث اس طوفان میں بہہ گیا اور علماء عوامی اعانت کی بدولت اسی طوفان کے دوش پہ سوار ہو کر دنیا کے سامنے آگئے ۔

شاہ کا دور مادی ترقی کا دور تھا، لیکن انسان مادی ترقی سے ایک حد تک ہی خوش رہتا ہے، مادی وسائل جسم کو غذا اور سکون تو مہیا کرتے ہیں مگر انسان کی روح اور قلب

کے بھی کچھ تقاضے ہیں، ان کو بھی غذا درکار ہوتی ہے، دل اور دماغ کو غذا نہ ملے تو ایک خاص وقت تک صبر کرتے ہیں، آخرکار آمادہ بغاوت ہو جاتے ہیں، دل و دماغ کی یہ بغاوت و سرکشی سر بکف لوگوں کو سڑکوں پر لے آتی ہے اور وہ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں، پھر

یا اپنا گریباں چاک یا دامنِ یزداں چاک

موجودہ دور میں اسلام کا نعرہ، انقلاب کی بات، اتحاد کی دعوت، جنگ کا اعلان، فتح کی آس، احتساب کا عمل، سزاؤں کی بازگشت اور مجرموں کی سرکوبی ہے، رہے مادی و معاشی مسائل تو اللہ کے نیک بندوں کے لئے توشۂ توکل ہی کافی ہے

تری خاک میں ہے اگر شرر تو خیالِ فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدارِ قوتِ حیدری

امامِ زمانہ کی بات ہم زمانے پہ چھوڑ دیتے ہیں لیکن شاہ کے دور میں دو خرابیاں تھیں، آزادی کا فقدان اور مذہب سے بیگانگی کا رجحان، انسانی روح آزادی کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے اور نہ مذہب کے بغیر پنپ سکتی ہے، انسان حریت و آزادی اور فکری رجحانات کو جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے، جب کوئی حاکم اپنے شہریوں سے یہ دو چیزیں چھین لیتا ہے تو لوگ اسے اپنا قاتل سمجھتے ہیں اور یہ بات شاید کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے قاتل کو کوئی بھی معاف نہیں کرتا، وہ قاتل بادشاہ ہو یا گدا، آمر ہو یا امام، مسٹر ہو، یا مجتہد، رندِ خرابات ہو یا عابدِ شب زندہ دار

دیدی کہ خونِ ناحق پروانہ شمع را
چنداں اماں نہ داد کہ شب را سحر کنند

شاہ کا دور اگرچہ بے پناہ مادی ترقی کا دور تھا، لیکن اس کے دور میں اہلِ ایران کی روح پیاسی تھی، پیاس بڑھی تو اضطراب اٹھا، اضطراب اٹھا تو انقلاب آیا، انقلاب

آیا تو امام خمینی اور ان کے رفقاء کے چہرے سامنے آئے' یہ انقلاب امام خمینی اور ان کے رفقاء کا انقلاب نہ تھا، یہ انقلاب اہل ایران کے قلب و نظر کا انقلاب تھا' یہ انقلاب ایک ایسی صداقت ہے جو آج بھی کشورِ ایران پر اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت جلوہ افروز ہے'

میرا دل ان لوگوں کی کوتاہ نظری پہ شاکی ہے جو کسی انقلاب کو اس کے عوام کی اجتماعی امنگوں کے آئینے میں دیکھنے کے بجائے اُن افراد کے کردار سے پرکھتے ہیں جن کو وقت' حالات اور اتفاقات حاکم بنا دیتے ہیں' اب ان بیدار بخت لوگوں کی اس خفتہ دماغی پر کوئی کہے تو کیا کہے

غمِ آرزو کو نہ تازہ کر' دلِ بے خبر یہ وہ آگ ہے
جو سُلگ اٹھی تو سُلگ اٹھی جو دبی رہی تو دبی رہی

ظہورِ انقلاب' ماہیتِ انقلاب اور عوامی جدوجہد کا تذکرہ ہوا ہے تو انقلاب کے ارتقاء' اس کی کیفیت اور قائدینِ انقلاب کے کردار پر بھی بات کر لینی چاہیئے۔ اس سلسلہ میں انقلابِ ایران کے پُرانے اور نئے دشمنوں کی طرف سے اب تک تین باتیں بصورتِ الزام سامنے آئی ہیں ۔

۱۔ پہلا الزام یہ ہے کہ اصل جھگڑا شاہ اور امریکہ کے درمیان تھا' شاہ کا تختہ الٹنے کے لیئے امریکہ نے ہی فضا سازگار کی۔ جس کے نتیجے میں انقلاب برپا ہوا' امام خمینی اسی انقلاب کے دوش پہ سوار ہو کر آئے۔

۲۔ دوسرے الزام کا خلاصہ یہ ہے کہ ایرانی سرزمین اور روسی توسیع پسندی میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے' روسی مفادات کو ایرانی سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ایران میں انقلاب کا اصل بانی روس ہے اور امام خمینی صرف اس کے آلۂ کار کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

۳۔ تیسرے الزام کا حاصل یہ ہے کہ امام خمینی کا انقلاب' اسلامی انقلاب نہیں' اسلام

کو وہ محض حربے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، جو جبریت شاہ کے دور میں تھی، وہی ان کے دور میں بھی موجود ہے، فرق یہ ہے کہ کسرٰی گیا ہے تو قیصر آگیا ہے، اسلام کی نظر میں دونوں برابر ہیں۔

الزامات تو اور بھی بہت سے ہیں مگر ان میں سرِ فہرست یہی تین ہیں، جن افراد یا حلقوں کی طرف سے یہ الزامات عائد کئے گئے ہیں، ان کے اپنے اپنے دلائل ہیں اور بعض دلائل خاصے وزنی ہیں۔

جو لوگ انقلابِ ایران کو امریکی دماغ کا کرشمہ قرار دیتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ شاہ کے اقتدار کو مضبوط کرنے میں امریکہ نے بہت نمایاں کردار ادا کیا تھا، لیکن شاہ نے امریکہ کی تمام تر نوازشات کو نظر انداز کر کے روس سے محبت کی پینگیں بڑھائیں، اس نے روس کے "ایشیائی سلامتی" کے منصوبے کو قبول کیا، حالانکہ اس منصوبے کو نہ صرف پاکستان نے مسترد کر دیا تھا، بلکہ بھارت جیسے روس نواز ملک نے بھی قبول کرنے کی ہمت نہیں کی تھی، اس طرح شاہ نے امریکہ کی خواہش کے علی الرغم روس سے تجارتی و اقتصادی معاہدے کئے اور ایک ایسے ہی معاہدے کے تحت روس کو ایرانی گیس کی فراہمی بھی شروع کر دی، شاہ کی یہ "نادر شاہی" حرکات امریکہ کے لئے ناقابل برداشت تھیں، چنانچہ انقلاب سے کچھ عرصہ قبل نیٹو افواج کے امریکی ڈپٹی کمانڈر انچیف جنرل ہوئسزر (HUYSER) تہران میں آبیٹھے اور خفیہ طور پر شاہ کے خلاف کام کرتے رہے، اس دوران انقلابی گروہ سے ان کے گہرے روابط کے قوی شواہد موجود ہیں، ان الزامات کو شاہ کی سوانح حیات اور انٹرویوز سے بھی تقویت ملتی ہے۔

یہ حلقے یہاں تک کہتے ہیں کہ جب امام خمینی پیرس میں اقامت پذیر ہوئے تو ان کی اقامت گاہ سے صرف چند گز کے فاصلے پر سی آئی اے نے ایک بلڈنگ حاصل کر لی تھی، سی آئی اے کے اہلکار یہاں سے نہ صرف امام خمینی کی سرگرمیوں پر نظر

رکھتے تھے بلکہ بعض ذرائع سے نامہ وپیام کا سلسلہ بھی جاری تھا اور سی آئی اے کے ان مہروں کے توسط سے امام خمینی کی مسلسل حوصلہ افزائی کی جارہی تھی

اس نقطۂ نظر کے حامل یہ کہتے ہیں کہ اس پوری کارروائی میں امریکہ کے پیش نظر تین مقاصد تھے، پہلا مقصد یہ تھا کہ شاہ کا ہر قیمت پر پتا صاف کیا جائے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ مذہبی قوتوں کے ذریعے ایران کو روس کی نظر باقی یلغار سے بچایا جائے اور تیسرا مقصد یہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب مذہبی قوتیں شاہ کو معزول کردیں تو فوج کو سامنے لاکر ان مذہبی قوتوں کا بھی صفایا کر دیا جائے اور پھر فوجی حکومت کے ذریعے ایران پر دوبارہ اپنی بالادستی قائم کرلی جائے۔

ان الزامات سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ برسہا برس تک دنیا کے تمام کام چھوڑ کر صرف شاہ کا تختہ الٹنے کی سازش میں مصروف رہا ہے، اس عرصے میں اس نے ایک کام کے سوا دنیا کا کوئی اور کام کیا ہی نہیں۔ اگر امریکہ مسائلِ جہاں سے فی الواقع اتنا آزاد اور دوسروں کے خلاف سازش کرنے میں ایسا جری ہے تو اسے اپنے محکوم شاہ ایران کے بجائے کسی بڑے حریف کا کام تمام کرنا چاہیئے تھا، امریکہ تو یقیناً اتنا احمق نہیں، لیکن الزامات کی فصل تیار کرنے والے خاصے احمق نظر آتے ہیں۔

مان لیا کہ شاہ ایران اور امریکہ کے درمیان چپقلش موجود تھی، امریکہ کی دلی خواہش ہو گی کہ شاہ کا تختہ الٹ جائے اور شاہ کے بعد جو حکومت قائم ہو وہ امریکہ کی تابع مہمل بن کر رہے، لیکن اس کے باوجود یہ باور کرنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس انقلاب میں مرکزی کردار امریکہ نے ادا کیا ہے، اگر اس مفروضے کو ایک ساعت کے لئے قبول کر بھی لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو امریکہ شاہ کا تختہ اُلٹ سکتا ہے اس کے لئے امام خمینی کا تختہ الٹنا کونسا مشکل کام ہے؟

شاہ اور امریکہ کے اختلاف کو "اصل" ماننے کے باوجود "اہم" ماننے میں ہمیں سخت تامل

ہے ۔ اہم اختلاف شاہ اور دینی قوتوں کے درمیان تھا ، جن کی رہنمائی امام خمینی کر رہے
تھے اور یہ اختلاف اس وقت سے تھا جب امریکہ شاہ کے خلاف کسی سازش کا تصور
بھی نہیں کر سکتا تھا ، رہی یہ بات کہ خود شاہ نے بھی امریکہ پر ہی الزام عائد کیا ہے
تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاہ کی عقلمندی کا تقاضا تھا کہ وہ ایک بے مایہ حریف
کے ہاتھوں ذلت قبول کرنے کے بجائے ایک بڑی طاقت کو اپنی رسوائی کا ملزم ٹھہرائے
بڑے لوگ چھوٹے آدمیوں کے ہاتھوں ملنے والی عزت پر اس ذلت کو ترجیح دیتے
ہیں جو بڑوں کی کارگزاری کا کرشمہ ہو ، اس میں کم از کم بڑائی تو موجود ہے ، بڑوں
سے نسبت ثابت کرکے نچر بھی اس بڑائی پہ ناز کرتی ہے

میرے ماموں کو نہیں پہچانتے شاید حضور
وہ صبا رفتار ، شاہی اصطبل کی آبرو !

ایران کی بنیادی طاقت روزِ اوّل سے ہی اس کی دینی قیادت رہی ہے ، شاہ اور
اس دینی قیادت کے مابین معرکہ برپا ہوا تو ابتدا امریکہ کی نظر میں اس معرکے کی کوئی
اہمیت نہیں تھی ، جب شاہ کا اقتدار ڈوبنے لگا تو امریکہ نے اس کی حمایت سے
دست بردار ہونا ہی بہتر سمجھا ، اس وقت امریکہ نے ایران کے بارے میں جو نئی
حکمتِ عملی تیار کی ، اس حکمتِ عملی کا جزو اعظم یہ تھا کہ دشمن کو مرنے دو اور دشمن کے
دشمن کو دوست بناؤ ، اگر امریکہ کی اس پالیسی سے امام خمینی کی تحریک کو کوئی فائدہ پہنچا ہے
تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ صدر کارٹر نے اپنی نئی پالیسی امام خمینی کے ساتھ کسی خفیہ
اجلاس میں بیٹھ کر مرتب کی تھی اور انقلاب کا اصل بانی امریکہ تھا ؟

اسی طرح اگر پیرس میں امام خمینی کی قیام گاہ کے قریب سی آئی اے کا کوئی دفتر تھا تو اس
سے بھی یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے کہ یہ دفتر امام خمینی کی مدد یا حفاظت کے لئے قائم کیا گیا ہو
مدد اور حفاظت تو دفتر قائم کئے بغیر بھی ہو سکتی تھی ، یہ بھی ممکن ہے کہ سی آئی اے کے دفتر اور

امام خمینی کی قیام گاہ کا قُرب محض سُوئے اتفاق ہو، اگر یہ سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ روس کو یہ باور کرانے میں مصروف تھا کہ اس کے اور امام خمینی کے درمیان ایک بہت ہی مضبوط دیوار حائل ہے۔

ہم بغرض بحث نہیں، بلکہ بصورت واقعہ اس نظریئے کو تسلیم کر لیتے ہیں کہ امریکہ نے شاہ کا ساتھ نہیں دیا مگر اس سے یہ بات ہر گز ثابت نہیں ہوتی کہ امریکہ نے امام خمینی کا ساتھ دیا ہے کیونکہ ایک فریق کا ساتھ ترک کرنا دوسرے کی حمایت کو مستلزم نہیں، اِس لئے امام خمینی کے نام سے منسوب انقلاب کو امریکہ کے کھاتے میں ڈالنا خمینی کے مخالفین کے حق میں مفید ہو سکتا ہے نہ ایران کے مستقبل کے لیے اچھے نتائج پیدا کر سکتا ہے اور نہ ہی یہ صورت حال خود امریکہ کے لئے خوشگوار ثابت ہو سکتی ہے، بلکہ اس اندازِ فکر کے نتیجے میں الٹا یہ نقصان ہوگا کہ ایران کی سیاسی قوتیں خود اعتمادی سے محروم ہو کر آئندہ ہر اقدام کے لئے امریکہ پر انحصار کریں گی، بنابریں کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ انقلابِ ایران کو امریکی سیاست گری کا کرشمہ قرار دیتے ہیں وہ محسوس یا غیر محسوس انداز میں امریکی "کاز" کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں عین ممکن ہے کہ خود امریکہ ہی نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے الزام کا یہ پودا لگایا ہو اور وہ خود ہی اس کی آبیاری بھی کرتا ہو لیکن یہ ایک ایسا پودا ہے جس کا پھل اس کے لگانے والے کے لئے کبھی نفع بخش ثابت نہ ہوگا۔

گندم از گندم بروید جو زِ جو

انقلابِ ایران اور روس کے کردار کے بارے میں ایران کے مختلف سیاسی حلقوں کی جانب سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس پر ہم "فکر فردا" کے زیرِ عنوان تفصیل سے بات کریں گے، سرِ دست ہم اس الزام کا جائزہ لیتے ہیں کہ امام خمینی کسریٰ کی جگہ قیصر بنکر نمودار ہوئے ہیں، وہ اسلام کے نعرے کو سیاسی حربے کے طور پر استعمال کر رہے ہیں

یا یہ کہ ان کا وجود بھی جبریت کی علامت اور دہشت کا عنوان ہے، واقعہ یہ ہے کہ ایران میں انقلابی حکومت کے ہاتھوں انقلاب دشمنی، سازش، بغاوت اور اس نوعیت کے دوسرے خوفناک الزامات کے تحت انسانی جانوں کا جو اتلاف ہو رہا ہے اسے اہل مذہب کی اس حکومت نے کبھی بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی، ممکن ہے جن لوگوں کو سزائے موت دی جاتی ہے، سرکاری اعداد و شمار میں ان کی تعداد کم دکھائی جاتی ہو یا سو آدمیوں کو پھانسی دیکر بیس افراد کے نام ظاہر کئے جاتے ہوں مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ حکومت ایران نے انسانی جانوں کے اتلاف کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا ہو۔

وائس آف امریکہ کی تازہ ترین اطلاع کے مطابق انسانی حقوق کے کمشن نے ایک رپورٹ میں بتایا ہے کہ ایران میں گزشتہ تین سال کے دوران بیس ہزار افراد کو سیاسی وجوہ کی بنا پر موت کے گھاٹ اتارا گیا، ان میں سے بعض کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ایران میں کردوں، ترکمانوں اور بہائیوں کی بڑی تعداد کو قانونی تقاضے پورے کئے بغیر ہلاک کر دیا گیا، ان پر اس مفہوم کے الزامات عائد کئے جاتے رہے ہیں کہ انہوں نے ملک سے غداری کی یا دشمن ملک کے لئے جاسوسی کے "فرائض" ادا کئے ہیں، اس کمشن نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ بیشتر صوبوں میں سزائے موت پانے والوں کو صفائی کا موقع بھی نہیں دیا گیا، سرسری سماعت ہوئی یا ویسے ہی فوجیوں نے گولی سے اڑا دیا، ان کا جرم یہ تھا کہ وہ حکمران طبقے کی سیاسی اور اقتصادی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کرتے تھے، اسی روز اخبارات میں یہ خبر بھی موجود تھی کہ ایران میں بیس بہائی لیڈروں کو سزائے موت دے دی گئی۔[۱]

۱؎ "نوائے وقت" ۱۸ فروری ۱۹۸۳ء

انسانی حقوق کے کمشن نے ان بیس ہزار افراد کی تعداد بتائی ہے جو گزشتہ تین برسوں میں موت سے ہمکنار ہوئے، جب کہ انقلاب کے ابتدائی دو برسوں میں سزائے موت پانے والوں کی تعداد اس سے زیادہ ہے، اگر عالمی اداروں کی تمام رپورٹوں کو پیش نظر رکھا جائے تو مرنے والوں کی جو تعداد سامنے آئے گی اسے دیکھ کر زندہ انسانوں کے دل پر ہول طاری ہو جائے گا۔ اگر اُن بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کو بھی مرنے والوں میں شامل کر لیا جائے جو میدانِ جنگ کی خاک میں گم ہو گئے تو ایرانی قوم کی نسل کشی کی جو بھیانک تصویر اُبھر ےگی اُسے مُہذّب دُنیا کا کوئی فرد دیکھنے کی ہمّت نہیں کر سکے گا، موت کے ان اعداد و شمار کا سامنا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، یہ محکمہ حضرت عزرائیل کے پاس ہے، جو ان دنوں ایران میں تشریف فرما ہیں جہاں ایسے لوگوں کی لمبی لائن لگی ہوئی ہے جو زبانِ بے زبانی سے کہہ رہے ہیں

نہ پوچھو میری انتہا موت ہے　　　وہ مُجرم ہوں جس کی سزا موت ہے

سفر نامہ اور قتل نامہ چونکہ قریب المعنیٰ الفاظ ہیں، اس لئے سفر نامے میں قتل نامے کی بحث فنی عیب نہیں کہلا سکتی، خاص طور پر سفر نامۂ ایران میں تو ہیجان کا در آنا اسکے اسم بامسمیٰ ہونے کی دلیل ہے، لیکن قتل و غارت کے موضوع کو عام طور پر پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا لہٰذا اس سے کم درجے کے موضوع ــــــ "جبریت" پر بات کر لیتے ہیں جو مسئلہ جبر و قدر کی ہمشیر ہے

ایران میں نسخۂ "جبریت" کا استعمال اتنا معیوب نہیں، جتنا یہاں سمجھا جاتا ہے، کوئی مُنصف مزاج آدمی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جس ملک میں قدم قدم پر انقلاب دُشمن، اسلام دشمن، اتحاد دشمن، غدار، جاسوس، سرکش، باغی اور منافقین خلق کی تعداد انقلاب دوست افراد سے زیادہ ہو، وہاں جبریت کا استعمال نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے

اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں!

میرا ذاتی خیال ہے کہ جرائم جزا طلب ہوتے ہیں، سزا طلب نہیں ہوتے ارتکابِ جرائم کے مقابلے میں اہتمام تربیت لازم ہے کیونکہ مجرم اور مریض کی حالت یکساں ہوتی ہے، اگر مریض قابلِ رحم ہے تو مجرم قابلِ نفرت کیوں؟ اگر مریض کے علاج کے لئے دوا خانے ہیں تو مُجرم کے لئے اصلاح خانے کیوں نہیں؟ جُرم بھی جبر ہے اور جبر بھی جُرم، جُرم سے روکنا جبر سے روکنا ہے، لیکن جب ایک جبر کو دوسرے جبر سے مٹایا جائے تو یہ گناہ بدتر از گناہ اور بنا فاسد علی الفاسد ہے، جب مجرم کو جبر سے روکنے کے لئے حکومت جبر سے کام لیتی ہے تو عدالتیں مزاحم ہوتی ہیں، جس ملک میں کوئی عدالت نہیں ہوتی اُس ملک میں انسانی شرف کی ہلاکت واقع ہو جاتی ہے۔

عدل کا ایک معنیٰ احسان بھی ہے، عدل میں قبولیت اور عطا دونوں ہیں، یعنی عادل عذر قبول کرے اور معافی عطا کرنے کا خوگر ہو، اس کے برعکس احسان میں عطا ہی عطا ہے، اِس میں یہ راز مضمر ہے کہ احسان صفت الٰہی ہے، جب منصف تختِ انصاف پہ بیٹھے تو خدا کی صفتِ احسان کی تصویر بن جائے، اس کے تختِ احسان سے انسان فیض یاب ہوں گے تو اس کو خدا اپنے تختِ احسان، عرش سے فیض یاب کرے گا۔

امریکہ دُنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے اور اس کا شہر نیو یارک دنیا کی سب سے بڑی جرائم گاہ، اگر نیو یارک میں سزا کی رفتار جرائم کی رفتار کے برابر کر دی جائے تو شہر قبرستان بن جائے اور "رُوٹ آف ڈیموکریسی" کا تصوّر خواب و خیال۔

میں نے اپنے قیام ایران کے دوران امام خمینی اور صدر علی خامینائی کو جو سوالنامہ دیا اس میں سلسلۂ جبریت کے بارے میں بھی سوال موجود تھا، میرا سوالنامہ ہنوز دست دراز ہے لیکن ان کے سینے کا در باز نہیں، جن رہنماؤں سے زبانی

بات ہوئی ان کے "ملفوظات" حافظے کے سپرد کرنے پڑے کہ وہاں قرطاس و قلم کا استعمال اور کارِ اطفال ہم معنیٰ تھے "آزادی" کے کمرے ہمارے تسلط ہیں اور ان کی کلید خواہرانِ ایران کے ہاتھ میں ——— باہر جائیں تو تحریر غیر محفوظ، اندر آئیں تو تقدیر غیر محفوظ ——— تحریر کو تج دیا اور عصمتِ تقدیر کی حفاظت کی

جان چھوٹی لاکھوں پائے　　　لوٹ کے اپنے گھر کو آئے

ایران کے جن بزرگوں سے جبریت کے عنوان پر بات ہوئی، ان کا موقف یہ تھا کہ قائدینِ انقلاب بہرحال گوشت پوست کے انسان تھے، وہ عالم الغیب نہیں تھے کہ افراد کا چناؤ کرتے وقت ان کی نظرِ انتخاب صرف فرشتہ سیرت انسانوں پر ہی ٹھہرتی ——— ان کے سامنے صالح اور غیر صالح ہر قسم کے افراد تھے، ان میں نیکوکار بھی تھے اور بدکردار بھی، اچھے بھی تھے اور بُرے بھی ——— اعلیٰ اخلاق کے مالک بھی تھے اور سفلی جذبات کے حامل بھی، پختہ سیرت بھی تھے اور ناپختہ فہم بھی ——— حکومت بنی تو صالح عناصر کے ساتھ غیر صالح بھی سرکاری عہدوں پر متمکن ہو گئے، قیامِ حکومت کے بعد چشمِ فلک نے جبریت کے بہت سے دلخراش مناظر بھی دیکھے، اعتدال کی جگہ بے اعتدالی بھی آئی، رحم و کرم کے بجائے ظلم و ستم سے بھی کام لیا گیا مگر اس میں اسلامی نظام کے چاہنے والوں کا کوئی تصور نہیں تھا، ایران کے سوادِ اعظم کی کوئی خطا نہ تھی، انقلاب کے لئے جسم و جاں اور رُوح و دل کا نذرانہ پیش کرنے والوں کی کوئی غلطی نہیں تھی ——— انقلاب کے بعد انقلاب کے نام پر اسلام کو جبریّت کا عنوان بنانے والے وہی ابلیسی صفت افراد تھے جو اس انقلاب میں شامل ہی اس غرض سے ہوئے تھے کہ وہ اپنی ابلیسی کارروائیوں کے ذریعے انقلاب کی رُوح کو فنا کے گھاٹ اتار دیں، یہ انہی مجرم ضمیر افراد کی مجرمانہ کارستانی تھی۔

ہم اس تاویل کے خلاف کوئی دلیل پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتے مگر تہران سے

بعض سیاسی حلقوں کا کہنا ہے کہ یہ تاویل حکومت میں شامل آزادانہ اظہارِ خیال کرنیوالے افراد کو ٹھکانے لگانے اور ان کی جگہ منظورِ نظر لوگوں کو آگے لانے کے لئے کی جاتی ہے کیونکہ حکومت میں شامل لوگ انفرادی طور پر کوئی قدم اٹھانے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حکومت کا ہر کارندہ اپنے اقدامات کے بارے میں امام کے سامنے جوابدہ ہے امام کے رضا کار ہر شخص کی سرگرمیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، یہاں تک کہ دفتروں میں آنے جانے اور سرکاری تقریبات میں شرکت سے پہلے ارکانِ حکومت کی جامہ تلاشی ہوتی ہے، اس قدر جبریت کے ماحول میں کوئی شخص اپنی ذاتی حیثیت میں کیا کر سکتا ہے؟

حکومت کے جملہ کام امام کی منظوری سے انجام پذیر ہوتے ہیں، لیکن جب کسی امر کے خلاف عالمی پریس آواز اٹھاتا ہے تو اسے کسی "ناپسندیدہ" فرد کے کھاتے میں ڈال دیا جاتا ہے، اس طرح کام بھی ہو جاتا ہے اور کسی فرد کی گردن ناپنے کا موقع بھی ہاتھ آجاتا ہے۔

ضروری نہیں کہ یہ تمام باتیں دُرست ہوں اور لازم نہیں کہ ہمیں بھی ان سے اتفاق ہو، ان باتوں میں مخالفین کی حاشیہ کاری بھی ہوگی، لیکن اس بات کے تو ہم چشم دید گواہ ہیں کہ جس روز امام خمینی سے علماء کی ملاقات تھی، اُس روز درجنوں علماء نے صدر جمہوریہ ایران کو بھی جامہ تلاشی کی "پل صراط" سے گزرتے دیکھا ہے۔

جبریت کا یہ الزام ایسے لوگوں پر بھی عائد ہوا ہے جن کو "بعض" کے خانے میں رکھ کر سرسے بلا نہیں ٹالی جا سکتی، قائدِ انقلاب کے نزدیک ان لوگوں کی صلاحیت اور صالحیت دونوں مسلّم تھیں، ان لوگوں کو قائد کی پشت پناہی، منصب کے گھمنڈ، تجربے کے فقدان اور اختیارات کے جوش نے ضرورت سے زیادہ جبری بنا دیا، وہ سزائیں سنانے میں جلد باز اور رحم و کرم کے باب میں سنگ دل نظر آنے لگے، ان لوگوں میں

جناب خلخالی کا نام زیادہ نمایاں ہے، تہران کی دو آٹھ سالہ بچی بھی ان کی دست برد سے نہ بچ سکی جو رجاوی کی تصویر سے کھیلتی ہوئی گھر سے باہر نکل آئی تھی، وہ معصوم یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ انقلاب کیا ہے، رجاوی کون ہے اور انقلاب سے اس کی کیا دشمنی ہے؟ اس وحشیانہ سنگدلی پر باز پرس کے بجائے حوصلہ افزائی کی گئی اور اس سنگدلی کو "عدل خلخالی" کا نام دیا گیا۔

حضرت خلخالی کے بارے میں یہ روایت تو دنیا کے کونے کونے تک پھیل چکی ہے کہ موصوف نے انقلاب اسلامی کی چکی میں ڈال کر لوگوں سے کروڑوں ڈالر وصول کئے اور سمگلروں کے سیاہ کاروبار سے بھی اپنا حصہ وصول کرتے رہے! کس قدر سچ ہے اور کس قدر جھوٹ، خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر کہنے والے کہتے ہیں اور برملا کہتے ہیں کہ خلخالی کے ہاتھ میں دیا گیا پھندا مجرم اور محرم کی تمیز کئے بغیر کام کرتا ہے، اس بارے میں وہ صرف یہ احتیاط کرتے ہیں کہ پھندے میں آنے والی گردن پھندے کے سائز سے چھوٹی یا بڑی نہ ہو

تقابل تاکہ محروم توازن ہی نہ رہ جائے

عین ممکن ہے کہ ان الزامات کے مقابلے میں اصل حقائق کہیں زیادہ ہوں، حکومت کے دیگر ستون بھی خلخالی کی طرح اندر سے کھوکھلے ہوں ان کے جرائم کی فہرست بہت طویل ہو اور ان جرائم کی نشاندہی کرنے والوں کی نظر اندرونِ خانہ نہ پہنچ سکی ہو لیکن اس کے باوجود انصاف و دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ انقلابِ ایران کو افراد کے کردار سے نہ پرکھا جائے، اسے ایرانی عوام کی امنگوں کے آئینے میں دیکھا جائے، انقلابِ ایران جیسا بھی ہے، اسلام کے نام سے منسوب ہو چکا ہے، جو لوگ اس انقلاب کے خط و خال سے ناآشنا ہیں وہ اسے اسلامی انقلاب سمجھتے ہیں اور جو اس انقلاب کے خط و خال کو جانتے ہیں مگر اسلامی نظامِ زندگی سے بے خبر ہیں وہ

بھی اسے اسلامی انقلاب کہنے پر مجبور ہیں، انقلابِ ایران کی سمت کو اگر اب بھی درست کر لیا جائے تو یہ مسلم دُنیا کے لئے کم از کم ایک ایسی علامت ضرور بن سکتا ہے، جسے چراغِ راہ منزل کہا جا سکے، اگر بے مغز فیصلوں، بے نور فتوؤں اور اندھے اقدامات کے ذریعے اس بنیاد ہی کو ختم کر دیا گیا تو مسلم دنیا میں صدیوں تک کسی اسلامی تحریک کو پنپنے کا موقع نہیں ملے گا اور اقامتِ دین کی تحریکوں کو اس عمل سے جو نقصان پہنچیگا آنے والی کئی نسلیں اس کا ازالہ نہیں کر سکیں گی، لہذا حکومتِ ایران اور اس کی بہی خواہ طاقتوں کو فوری طور پر اپنا قبلہ درست کرنا ہوگا، اگر ایسا نہ کیا گیا تو انقلاب اور اہل انقلاب وقت کے طوفانی دھاروں میں ڈوب کر رہ جائیں گے، اس لئے وہ راستی کی اس منزل کی طرف جتنی جلدی قدم بڑھائیں گے، ان کے حق میں یہ پیش قدمی اتنی ہی بہتر ہوگی

تھوڑا وقت ہے بیت نہ جائے، وقت نہ جائے بیت!

استقبال

بند اجلاس ——— کھلی باتیں

فکرِ فردا

مُصنّف ——— مصروفِ مطالعہ

ہمسفر ——— مصروفِ نشاط

ایران کے شہر ہوں یا بازار، قریے ہوں یا قصبے، گلیاں ہوں یا محلے، سڑکیں ہوں یا چوراہے، سرکاری عمارتیں ہوں یا تجارتی مراکز، تھانے ہوں یا جیل خانے، فوجی بیرک ہوں یا رفیوجی کیمپ، آزاد شہریوں کی اقامت گاہیں ہوں یا جنگی قیدیوں کی تربیت گاہیں، ہوٹل ہوں یا دکانیں، مدارس ہوں یا مساجد، گرجے ہوں یا خانقاہیں، مردوں کی چھاتیاں ہوں یا خواتین کے سینے، پاسداروں کی وردیاں ہوں یا پاسبانوں کی ٹوپیاں، حزب اللہ کے بچے ہوں یا حزب اسلامی کے علماء، کرنسی نوٹ ہوں یا دھات کے سکے، ڈاک کے لفافے ہوں یا ٹکٹ، ریڈیو ہو یا ٹیلی ویژن، اخبارات و جرائد ہوں یا درسی کتب، تہران کا ایئرپورٹ ہو یا قم کا حوضہ علمیہ، میدانِ آزادی ہو یا محاذِ جنگ، مجلس ملی کا دروازہ ہو یا محرابِ مسجد، زندہ افراد کی بستیاں ہوں یا مردہ انسانوں کی آرام گاہیں، ہر گام اور ہر مقام پر امام خمینی کی تصویر ہے!

صاحبِ تصویر اور ناظرینِ تصویر کا تعلق ہے تو عجیب، رابطہ ہے تو انوکھا، میلان ہے تو نرالا، رجحان ہے تو دلچسپ، التفات ہے تو ناقابلِ فہم، محبت ہے تو عقل سے ماورا، عشق ہے تو ادراک سے بالا، جنون ہے تو جنونِ اعلیٰ! — قرب ہے تو محتاجِ فاصلہ، فاصلے ہیں تو محتاجِ قربت، اُجالا ہے تو اندھیرے میں ڈوبا ہوا، اندھیرا ہے تو اجالے میں اُلجھا ہوا، حدید ہے تو حریر کی صورت، حریر ہے تو حدید سے مشابہ — تصویر حاضر امام غائب، تصویر زیرِ نظر اور امام بالائے نظر!

ع کوئی جانے تو کیا جانے کوئی سمجھے تو کیا سمجھے؟

ایران کے طول و عرض میں امام کی تصویر کا خوف ہے یا تعذیر کا ڈر، افراد کی تقدیر اور تدبیر ان دونوں کی اسیر ہے، امام کے لب اور قوم کے دل ایک ساتھ حرکت کرتے ہیں لبوں کی حرکت دلوں کی دھڑکن، دلوں کی دھڑکن لبوں کی حرکت، دونوں لازم، دونوں ملزوم اور دونوں لازم ملزوم — امام غائب ہو تو قوم حاضر نہیں رہتی، امام حاضر ہو تو قوم غائب

نہیں ہوتی، لازم ہوا کہ حاضر ہوں تو ایک ساتھ، غائب ہوں تو ساتھ ساتھ

من تو شدم تو من شدی من جاں شدم تو تن شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری !

مرحلۂ دشوار تر یہ ہے کہ امام ——— امام اصغر ہو تو حاضری کا طالب، امام امام اکبر ہو تو حضوری کا طلبگار! یہاں تو معاملہ ہی اور ہے، امام ہے ——— امامِ امّت، جسے امّت کے قرب سے زیادہ خدا کی قرابت کی ضرورت ہے، طے پایا کہ امامِ امت خدا کے حضور، خدا کے بندے تصویرِ امام کے حضور ——— لہٰذا تصویر حاضر ہے، امام غائب، تصویر منظر پہ ہے اور امام پس منظر ہیں ———

اک قصۂ طویل کا یہ اختصار ہے

بُت پرستی اسلامی عقائد کی رُو سے حرام ہے مگر ایران میں انقلاب اسلامی کے بعد شخصیت پرستی کا جو طوفانِ جنوں آیا ہے، تاریخِ انسانی میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، ایسا لگتا ہے، خدا بندوں کے درمیان آگیا ہے اور بندے اُس کی آمد کا جشن منا رہے ہیں، امام کی ذات بُت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے، پوری قوم اس بُت کی پوجا میں مصروف ہے۔ امام خمینی کی تصویر ان کے پیروکاروں کے لئے تو خیر مقدس باپ کی تصویر ہے، یہی تصویر پیشہ ور مجرموں کے لئے بھی ایک ڈھال ہے، وہ اس تصویر کی آڑ میں بدکاری کے بیج بوتے اور جرائم کی فصل اُگاتے ہیں، حد یہ کہ ایران کے ارباب حکومت کی نظر میں وہی شخص مسلمان اور انقلابی ہے جس کے پاس امام کی تصویرِ دلپذیر ہے، جس کے پاس یہ تصویر نہیں، وہ اسلام دشمن، انقلاب دشمن اور غدار ہے!

جہاں معیارِ ایمان تصویر کی پرستش ہو، وہاں معیارِ کفر خدا کی پرستش کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ محض ایک منطقی نتیجہ نہیں، امرِ واقعہ ہے، ایران کی عمامہ پوش مخلوق اکثر پاکستانیوں سے سوال کرتی ہے، پاکستان بنانے میں سامراج کو کیا دلچسپی تھی؟

پاکستان میں کتنے فیصد مسلمان ہیں؟ ـــــ امریکہ کا ایک فوجی جرنیل پاکستان پر کیسے حکومت کر رہا ہے" ؟

حیرت ہے کہ ایران میں "اسلامی انقلاب" کے ظہور سے پہلے کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ پاکستان کا قیام سامراج کی کاوش ہے، سابق حکمران رضا شاہ پہلوی کو اتنا علم بھی نہیں تھا کہ پاکستان ایک "غیر مسلم" ریاست ہے جس میں مسلمان ایک حقیر اقلیت ہیں ـــــ! یہ سب باتیں اُن فرزانِ "انقلابِ اسلامی" کو پہلی بار معلوم ہوئی ہیں، جن کے سیاسی تولّد کو ابھی پورے چار ہفتے نہیں گزرے!

کیا ایران کی "اسلامی قیادت" کو یہ بات معلوم نہیں کہ قائداعظم کون تھے اور عالمِ اسلام میں ان کا مرتبہ و مقام کیا تھا، کیا ایران کی قیادت تاریخ کی اس عظیم صداقت سے واقعی بے خبر ہے کہ قائداعظم نے سامراج اور رام راج دونوں کو شکست سے دوچار کر کے پاکستان حاصل کیا تھا، کیا کشورِ ایران کے اہلِ علم اس حقیقت سے ناآشنا ہیں کہ قائدِ اعظم کا پاکستان دُنیا کی دوسری سب سے بڑی اسلامی ریاست ہے، کیا ایران کی یہ نئی مریخی مخلوق اتنا بھی نہیں جانتی کہ اس وقت کرۂ ارض پر پاکستان ہی وہ دوسری واحد سلطنت ہے جو ۸ کروڑ مسلمانوں نے اسلام کے نام پر اسلام کے عملی نفاذ کیلئے حاصل کی تھی، کیا ان لوگوں کو آج تک یہ بات کسی نے نہیں بتائی کہ مسلم دنیا میں پاکستان ہی وہ منفرد ملک ہے جو عملی و نظری اعتبار سے سب کا رہنما ہے، وہ نہیں جانتے کہ پاکستان مسجدوں اور مدرسوں کا گلشن ہے اور روئے زمین کی سب سے بڑی عبادت گاہ، مسجد عالمگیری اسی کے شہر لاہور میں ہے!

لگے ہاتھوں کیوں نہ یہ سوال بھی کر دیا جائے کہ ایران کی موجودہ حکومت کو سب سے پہلے کس ملک نے تسلیم کیا تھا، اگر وہ پاکستان تھا اور یقیناً پاکستان تھا تو پھر ایران میں دریافت ہونے والی خدا کی ان "آیتوں" کو اس سوال کا جواب بھی

دینا ہوگا کہ پاکستان کے "امریکی جنرل" کو ایران کی "اسلامی حکومت" کو تسلیم کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟ اگر امریکی جرنیل اسلامی حکومتوں کے اتنے ہی قدر دان ہیں تو ان کے فرشتہ سیرت ہونے میں کیا کلام ؟

ایران کے فرزندانِ انقلاب کے یہ زہر بھرے سوالات بے خبری کی دلیل نہیں تنگ نظری کے آئینہ دار ہیں، وہ جانتے ہیں کہ پاکستان خدا پرستوں کا ملک ہے، ہوا پرستوں کا دیس نہیں، وہ پاکستان، قائدِ پاکستان اور نظریہٗ پاکستان کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں، صرف ماننے میں تامّل ہے، ان کا کونسا سوال وضاحت طلب اور ہماری کونسی وضاحت، محتاجِ وضاحت ہے ؟ ہماری تاریخ ایرانی دلوں میں ابھرنے اور زبانوں پہ مچلنے والے ہر سوال کا جواب دے چکی ہے اور دے رہی ہے۔ اگر اس تاریخ پر کسی کی نظر نہیں جاتی تو تاریخ کا قصور نہیں، نظر کا فتور ہے

آنکھیں اگر ہیں بند تو پھر دن بھی رات ہے
اس میں بھلا قصور کیا ہے آفتاب کا

امام خمینی نے اپنے موجودہ منصب پہ فائز ہونے کے بعد بھارتی وزیرِ اعظم مسز اندرا گاندھی کو جو مبینہ نامۂ محبت تحریر کیا، اس میں یہ ارشادِ رشد و ہدایت بھی موجود ہے کہ ہندوستان کی زمین پر مہاتما گاندھی حضرت علیؓ کی تعلیمات کے ترجمان تھے اس لئے ہندوستان اور ایران کے درمیان محبت کا لازوال اور ناقابلِ شکست رشتہ موجود ہے، سوال یہ ہے کہ اگر ایران کا منصب "ولایتِ فقیہہ" مہاتما گاندھی کو جانتا ہے تو قائدِ اعظم کو کیوں نہیں جانتا؟ اس سوال سے ہماری غرض یہ نہیں کہ امام خمینی مہاتما گاندھی کو آیت اللہ قرار دینے کے بعد قائدِ اعظم کی حیثیت کا تعین کریں، قائدِ اعظم کا مقام تو ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے اجماع نے متعین کر دیا تھا، ہماری تاریخ میں امّت کا اتنا بڑا اجماع صرف

قائد اعظم کی قیادت پر ہوا ہے، کسی اور کی قیادت پر ہرگز نہیں ہوا، اس لیئے قائد اعظم کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کے لئے اب کسی امام کے فتوے اور مجتہد کے اجتہاد کی ضرورت نہیں، امام اور مجتہد کو صرف آنکھیں کھلی رکھنے کی ضرورت ہے۔ آنکھیں کھلی رکھنے کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ آدمی ٹھوکر کھانے سے بچ جاتا ہے۔

بات "امامِ امّت" کی تصویر سے چلی تھی کتابِ اجتہاد کی تفسیر تک پہنچ گئی، ایران میں اس تصویر کی پرستش کی بابت پُرسش کریں تو بڑے عجیب وغریب لطیفے سامنے آتے ہیں ایسے ہی چند لطیفے جناب صلاح الدین نے اپنی کتاب "انقلاب ایران" میں بھی تحریر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں :۔

"امام خمینی کی تصویر ایک بُت کی صورت اختیار کر گئی ہے، کوئی عمارت، اس کا اندرونی گوشہ، مکان، دکان، مدرسہ، حتیٰ کہ مسجد کے صحن و محراب، بجلی کے کھمبے، درخت کے ستنے، بسیں، ٹرک، گاڑیاں ـــــ غرض کوئی ایسی ساکت و متحرک چیز موجود نہیں جس پر امام خمینی کی تصویر آویزاں یا چسپاں نہ ہو، اب کوئی کتاب، اخبار، رسالہ ایسا نظر نہیں آتا جو ان کی تصویر سے مزیّن نہ ہو، میں نے تہران ہی میں ایک دلچسپ تبصرہ سنا۔ ایک صاحب نے فرمایا کہ ـــــ "میں دعوے سے کہتا ہوں، آپ اس کی تصدیق کر لیجئے، جب سے کیمرہ ایجاد ہوا ہے، اس نے دنیا میں کسی ایک فرد کی اتنی تصویریں نہیں اتاریں جتنی امام خمینی کی اتاری ہیں، میں نے ستر کروڑ چینیوں کے ملک میں ماؤ کی تصویروں کا ذکر کیا تو انہوں نے اپنے دعوے پر اصرار کرتے ہوئے کہا کہ ماؤ کی تصویریں، خمینی کی تصویروں کا پچاس فیصد بھی نہ ہوں گی ـــــ ہمارے کانوں تک ایک فقیہہ کا یہ تبصرہ بھی پہنچا کہ امام خمینی نے امام مہدی کی صورت اختیار کر لی ہے۔"

جناب صلاح الدین نے دو برس پیشتر یہ نقشہ دیکھا تھا، "انقلاب اسلامی" نے اس نقشے میں اب نئے رنگ بھر دیئے ہیں اور صورت حال پہلے سے زیادہ ہوشرُبا ہے،

میں نے ایک اردو شناس دوست کے سامنے ذرا جھجکتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ شاید قرآن ہی وہ منفرد کتاب ہے جو اب تک امام خمینی کی تصویر سے بچی ہوئی ہے، وہ دوست کہنے لگے "اس حد تک تو آپ کا خیال درست ہے کہ قرآن پر امام خمینی کی تصویر شائع نہیں ہوئی، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ امام کی تصویر قرآن سے دور ہے" پھر وہ فخریہ انداز میں گویا ہوئے کہ امام کے پیروکار نماز اور تلاوت کے وقت امام کی تصویر الگ نہیں کرتے، نماز میں تصویر سامنے ہوتی ہے جب کہ تلاوت کے خاتمہ پر نشانی کے طور پر قرآن کے اوراق میں بھی یہی تصویر رکھی جاتی ہے"

قرآن میں تو ہم نے امام خمینی کی تصویر دلپذیر نہیں دیکھی، کیونکہ قرآن پڑھتے ہی کسی کو نہیں دیکھا، البتہ نماز کے وقت اکثر و بیشتر امام کی تصویر سامنے ہی نظر آئی، ایرانی نماز میں یہ آسانی ہے کہ ظہر، عصر اور مغرب، عشا کو ایک ساتھ پڑھ لیا جاتا ہے اس طرح چوبیس گھنٹوں کے دوران زیادہ سے زیادہ، تین بار جماعت کی نوبت آتی ہے، "زیادہ سے زیادہ" کا لفظ ہم نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ نماز فجر کی جماعت کا اہتمام کم کم ہوتا ہے، ایران میں اپنے بیس روزہ قیام کے دوران نماز فجر کی جماعت دیکھنے کی ہم ایک بار بھی سعادت حاصل نہیں کر سکے، جمع بین الصلوتین اگرچہ جائز ہے مسافر حالتِ سفر اور مقیم حالتِ مجبوری میں ایسا کر سکتا ہے، لیکن کسی جائز امر سے جائز حد تک ہی فائدہ اٹھانا جائز ہے۔ اسے فرض کا درجہ دیکر اختیار کرنا بڑی خطرناک بدعت ہے، عالمِ اسلام میں مسلمانوں کا کوئی فرقہ یہ عمل نہیں کرتا، یہ عمل ہمیں صرف انقلابِ ایران کا کرشمہ نظر آتا ہے!

لفظ کے استعمال اور محل استعمال کی بات آئی ہے تو لفظ "نماز" پر بات کر لینے میں بھی کوئی حرج نہیں، نماز کا لفظ اصلاً ایرانی ہے، جس عبادت کو ہم نماز کہتے ہیں، عربی میں اس کے لئے لفظ "صلوٰۃ" ہے، بالفاظِ دگر "صلوٰۃ" کی قرآنی اصلاح ایک مخصوص طرزِ

عبادت کی نشاندہی کرتی ہے اس کے برعکس نماز کی عجمی اصطلاح ظہورِ اسلام سے پہلے بھی موجود تھی مگر اس وقت یہ اصطلاح خالصتاً "آتش پرستی" کے لئے بولی جاتی تھی، آج اسے "خدا پرستی" کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

یہ بات میرے لئے تادمِ تحریر تحقیق طلب ہے کہ "صلوٰۃ" کی جگہ نماز کا لفظ سب سے پہلے کس نے استعمال کیا اور کب کیا لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ اس اصطلاح کے استعمال کی مدت ایک صدی سے زیادہ نہیں ہوگی، اس اصطلاح کا استعمال غالباً اُس دور میں شروع ہوا ہوگا جب عجمی سازش کے تحت قرآن کی عربی اصطلاحات کو بُرے معنی پہنائے گئے اور یہ مقدس اصطلاحات آج بھی بُرے معنوں میں استعمال ہورہی ہیں مثال کے طور پر "صلوٰۃ" کا لفظ گالی کے معنوں میں یوں استعمال کیا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے فلاں آدمی کو خوب "صلاتیں" سنائیں، خلیفہ اسلامی حکومت کے سربراہ کا مخصوص لقب تھا، اس لفظ سے قوت، ہیبت اور شجاعت کا تصور ابھرتا تھا، کچھ عرصہ سے اس لفظ کو عجمی سازش کے تحت حجام اور ہاتھ پاؤں سے معذور لوگوں کے لئے استعمال کیا جانے لگا ہے، زیدؓ، عمرؓ و بکرؓ، اصحابِ رسولؐ کے نام ہیں مگر اصحابِ رسولؐ کے دشمنوں نے یہ نام ایرے غیرے، نتھو خیرے، افراد کے قائم مقام استعمال کرنے شروع کر دیئے۔ عبادت گزار کو مصلّی کہا جاتا تھا، ان دشمنانِ دین نے غلاظت جمع کرنے والوں کو مصلّی کہنا شروع کر دیا، لفظ صوفی متقی اور عبادت گزار کے لئے بولا جاتا تھا، اب جیب کٹ اور مارکٹ مار کو صوفی کہا جانے لگا ہے، شریف کی بات تو سب جانتے ہیں، ہماری کتابوں میں کہاں کہاں شریف کی تکرار ہے، قرآن شریف، بخاری شریف، مسلم شریف، ترمذی شریف، نسائی شریف ـــــ اب شریف بدمعاش "کی اصطلاح چل نکلی ہے، آپ کس کس شریف کی خیر منائیں گے؟

صدرِ اوّل سے لیکر اب تک ہم بزرگ شخصیت کو "حضرت" کہتے چلے آئے ہیں مگر

فی زمانہ لچے، لفنگے، فریبی، دغاباز، کمینہ خصلت، مکار اور بدفطرت آدمی کو "حضرت" کہا جاتا ہے۔ "ملا" ہمیشہ قابلِ احترام لفظ سمجھا گیا ہے، یہ لفظ ہمارے بڑے بڑے ذی قدر آئمہ کرام کے ناموں کا حصہ ہے، مثلاً ملا علی قاری اور ملا حسن وغیرہ، مگر ابلیسِ عجم نے اس میں اپنے نام کی معنویت پیدا کرنے کے لئے "مُلاں" کا لفظ ایجاد کیا، جسے ہم بلا تکلف استعمال کرتے ہیں، لفظ "بزرگ" ہی کو لے لیجئے، اس میں ایک احترام اور تقدس پایا جاتا ہے، ہم اپنے مشاہیر کو بزرگ کہتے ہیں، باپ دادا کو بھی بزرگ کہا اور سمجھا جاتا ہے مگر ایران میں "انقلابِ اسلامی" کے بعد امریکہ کو بھی شیطانِ بزرگ کہا جانے لگا ہے، اس طرح اہلِ انقلاب نے ایک ہی جنبشِ لب کے ساتھ شیطان اور امریکا دونوں کو اپنے بزرگوں میں شامل کر لیا

اے انقلابِ دہر تری عظمتوں کی خیر　　شیطاں کو احترام کے قابل بنا دیا

ایران میں "شیطان بزرگ" امریکہ کے خلاف نعرے انقلابِ جدید کی جان ہیں اور ان نعروں نے ایرانی عوام کو امریکہ کے خلاف طوفانِ غیض و غضب بنا رکھا ہے مگر ایران کے بعض موسمہ دار سیاسی و دینی حلقے "ایران، امریکہ اختلاف" کو "نمائشی جنگ" قرار دیتے ہیں، ان حلقوں کا کہنا ہے کہ ایران کی مذہبی قیادت بظاہر امریکہ کے خلاف نعرے لگواتی، جلسے کراتی اور جلوس نکلواتی ہے، لیکن اندرونِ خانہ دونوں نے ساز باز کر رکھا ہے، ان حلقوں کے مطابق امریکہ کو اس بات کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ امریکی یرغمالیوں کو آزاد کرانے کے لئے کوئی "جنگی" قسم کی کارروائی کرتا، کیونکہ وہ اس بات کو بخوبی سمجھتا تھا کہ ایران نے جس سفارتی عملے کو یرغمالی بنایا ہے اس کی جان محفوظ ہے، لیکن حضرتِ کارٹر نے اپنا ایک ناکارہ ہیلی کاپٹر صحرائے ایران میں تباہ کرا کر دنیا بھر کو یہ تاثر دینے میں کامیابی حاصل کر لی کہ خمینی "مافوق البشر" ہستی ہے، اس طرح وہ خمینی حکومت کو ایرانی عوام کی نظروں میں پہلے سے زیادہ مقبول بنانا چاہتے تھے، انہیں اپنے مقصد میں کامیابی

حاصل ہوئی، اس واقعے کے بعد اصولی طور پر امریکی یرغمالیوں کی رہائی مشکل ہو جاتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایرانی حکومت کے رویّے میں لچک آنے لگی، یہاں تک کہ امریکی یرغمالیوں کو انتہائی معمولی شرائط پر چھوڑ دیا گیا اور پہلے یرغمالیوں کی رہائی کے بدلے جو مطالبے انتہائی شدّ و مد سے اٹھائے گئے تھے، آخری مرحلے میں انہیں محض رزن بیت سے کے طور پر دُہرایا گیا، نہ اِن مطالبات پر اصرار ہوا اور نہ ہی منظور ہوئے۔ اگر خمینی حکومت کے مطالبات حرفِ آخر تھے اور ان کے بغیر یرغمالیوں کی رہائی ممکن نہیں تھی تو مطالبات تسلیم کرائے بغیر یرغمالیوں کی رہائی کیسے عمل میں آئی ؟

میں نے اس رائے کا اظہار کرنے والے افراد سے استفسار کیا کہ امریکی ہیلی کاپٹر کی تباہی ڈرامہ تھی تو امریکی سفارت کاروں کو یرغمالی بنانا کیا تھا ؟

اس سوال کے جواب میں کہا گیا کہ امریکی سفارت کاروں کو یرغمالی بنانے کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ میں مقیم اُن آٹھ لاکھ ایرانیوں کو ردّ عمل کے طور پر کچل دیا جائے جو خمینی کی پالیسیوں سے متفق نہیں، چنانچہ خمینی نے ایک تیر سے دو شکار کئے، ایک طرف امریکی یرغمالیوں کے بارے میں انتہا پسندانہ پالیسی اختیار کر کے پوری دُنیا کو یہ باور کرا دیا کہ امریکہ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں اور دوسری طرف امریکہ میں مقیم ایرانی امریکی عوام کے غیض و غضب کا نشکار ہوئے، وہ امریکہ میں بیٹھ کر خمینی حکومت کے خلاف جو تحریک منظم کرنا چاہتے تھے، وہ تحریک ابتدا ہی میں دم توڑ گئی، علاوہ ازیں پوری دنیا میں ایرانی نوجوانوں کا کردار مشکوک ہو گیا اور شاہ کی حامی یا خمینی کی مخالف تنظیمیں دنیا کے جن جن ممالک میں کام کر رہی تھیں، وہاں ان کی نگرانی شروع ہو گئی، اس طرح خمینی نے بین الاقوامی محاذ پر اپنی مخالف قوتوں کو بھرپور شکست دی اور یہ کام اس نے امریکہ کے ساتھ ملی بھگت کر کے انجام دیا۔

ایران کے جو حلقے یہ رائے رکھتے ہیں، وہ ایران اور امریکہ کے درمیان ایک خفیہ

معاہدے کی نشاندہی بھی کرتے ہیں' ان حلقوں کا کہنا ہے کہ جس زمانے میں خمینی جلاوطن ہوکر پیرس پہنچے اُس زمانے میں انہوں نے فرانس کی مدد سے امریکہ کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کیا' جو مؤثر بہ مستقبل تھا اور اسی معاہدے کے تحت فرانس نے انہیں سیاسی پناہ دی تھی۔

اس معاہدے کا اہم نکتہ یہ تھا کہ اگر خمینی اقتدار پر قابض ہونے کے بعد امریکہ سے جان چھڑانا چاہیں تو ان کے لئے ایسا کرنا عملی طور پر ممکن نہ رہے اور تعلقات کشیدہ ہونے کے باوجود معاہدے پر عملدرآمد ہو سکے' اس نکتے کے نتیجے میں فرانس کو بھی فریق معاہدہ بنایا گیا' مبینہ معاہدے کا جو لُبِ لباب بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایران فرانس کو تیل مہیا کریگا' جس کی قیمت فرانس امریکہ کو ادا کرے گا' امریکہ اس رقم کے عوض فرانس کو ایران کے لئے گولہ بارود اور فاضل پرزے مہیا کرے گا' جو ایرانی حکومتِ فرانس سے حاصل کرے گی' اسطرح اس معاہدے کی رو سے ہر سہ فریق فائدہ اٹھانے کے حق دار ہوں گے !

خمینی کے مخالف حلقوں کا استدلال یہ ہے کہ جب ایران کا امریکہ سے بالواسطہ لین دین موجود ہے تو اختلاف کی نوعیت بدل جاتی ہے' یہ اختلاف ایک ایسا اتحاد ہے' تاکہ رفاقت پر رقابت، محبت پر نفرت، صلح پر جنگ، پیار پر تکرار اور تعلق پر عدمِ تعلق کا پردہ پڑا رہے' یہ راز کسی حال میں باز نہ ہو کہ خمینی نے پیرس میں بیٹھ کر امریکہ کے ساتھ کوئی خفیہ گٹھ جوڑ کیا تھا مگر چھُپ کر کئے جانے والے کام کھل کر رہتے ہیں اور کان میں کہی جانے والی بات جہان سے نکل جاتی ہے' ایران کی حکومت نے اس راز کو بھی "لفظی تُو تکار" کے پردے میں چھپانا چاہا' لیکن عملی تعلق نے حیلہ گری ناکام بنادی۔

ظاہر ہے بیقراریٔ پیہم سے حالِ دل
بیکار ان کو دعوۂ اخفائے عشق ہے

گزشتہ باب میں اس الزام کو ہم دلائل کے ساتھ رد کر چکے ہیں کہ ایران کی مذہبی

حکومت کو برسرِ اقتدار لانے میں امریکہ نے کوئی کردار ادا کیا تھا، لیکن انقلاب کے قریبی ذرائع "معاہدہ پیرس" کے حق میں جو دلائل دیتے ہیں، انہیں یکسر نظر انداز کرنا خاصا مشکل ہے، علاوہ ازیں یہ ذرائع "ایران، اسرائیل معاہدے" کے بارے میں جو کچھ بتاتے ہیں۔ اس کی تاویل کا تو تصور ہی قلم پر "نزع" کی کیفیت طاری کر دیتا ہے اور ہم اپنے تمام تر حسن ظن کے باوجود اس کی کوئی تاویل نہیں کر سکتے۔

انقلابی حکومت کے انقلابی حریفوں کا کہنا ہے کہ اسرائیل کا وجود امریکہ کی سیاسی خواہشات کا کرشمہ ہے، اس کی حفاظت امریکہ کی اپنی ہی خواہشات کی حفاظت ہے، امریکہ "بہادر" اپنے مفاد کے لئے اپنی مصلحتوں کے تحت عالمِ عرب سے جس طرز کے محتاط تعلقات رکھنا چاہتا ہے، ان کا بھی تقاضا ہے کہ اسرائیل کی حمایت اور امداد جاری رکھی جائے، لیکن امریکہ کی طرف سے اسرائیل کی امداد عربوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی، وہ جب بھی اسرائیل کی کھلی سرپرستی کرتا ہے، عرب اسے تیل کا ہتھیار استعمال کرنے کی دھمکی دیتے ہیں، امریکہ جیسی بڑی طاقت کے لئے یہ چیلنج ناقابلِ برداشت ہے مگر وہ اسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے پر مجبور ہے کیونکہ عربوں سے قطع تعلق اس کے اپنے حق میں مفید نہیں۔

امریکہ کے لئے مشکل یہ ہے کہ وہ اسرائیل اور عالم عرب، دونوں کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اسرائیل کی سرپرستی ترک نہ کرنے کی وجہ امریکی معیشت پر یہودی دولت کے ہمہ گیر اثرات ہیں اور عربوں کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں روس کے لئے میدان خالی کر دیا جائے یا عربوں کو ناراض کر کے نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری دنیا کو اپنا مخالف بنا لیا جائے، کیونکہ اسرائیل کی غنڈہ گردی، استم شعاری اور توسیع پسندی کے خلاف عربوں کا موقف اتنا سچا، اتنا حقیقی، اتنا درست، اتنا واضح اور اتنا اٹل ہے کہ اقوام عالم اس کی حمایت پر مجبور ہیں، جہاں تک عالم اسلام کا تعلق ہے تو وہ عربوں کو کعبے کا پاسبان

اور روضۂ رسولؐ کا پاسدار سمجھتا ہے، لے دیکھئے ایران کی مذہبی حکومت ہی ایک ایسی "فورس" ہے جو اسرائیل کے حق میں امریکہ کی سیاسی مدد کر سکتی ہے۔ کیونکہ ایران اور اسرائیل دونوں عرب دشمنی میں متفق ہیں، اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں پر مستقل طور پر تسلط قائم کرنے کے لئے کوشاں ہے اور ایران کعبۃ اللہ پر قبضے کے خواب دیکھ رہا ہے، چنانچہ امریکہ کی جدید حکمتِ عملی یہ ہے کہ ایک طرف تو عربوں کی "سرکشی" کو کم کرنے کے لئے اسرائیل کی پُشت پناہی کی جائے اور دوسری طرف ان کی "سرکوبی" کے لئے ایران کی مذہبی حکومت کو استعمال کیا جائے، ان لوگوں کے خیال کے مطابق ایران، عراق جنگ میں یہ "فلاسفی" کارفرما ہے کہ عربوں کی اجتماعی قوت کو عراق کے محاذ پر لا کر تباہ کیا جائے اور اس وقت تک جنگ بندی نہ ہونے دی جائے، جب تک عرب ممالک بے دست و پا ہو کر اسرائیل کو تسلیم نہ کرلیں، جب عرب اس مقام تک آجائیں گے تو اسرائیل مقبوضہ عرب علاقوں میں استحکام حاصل کرلے گا اور ایران کے لئے کعبۃ اللہ پر قبضے کی راہ بھی ہموار ہو جائے گی۔

مجھے احساس ہے کہ انقلابِ ایران کے دشمنوں کی باتوں میں مبالغہ بھی ہوگا مگر میرے نزدیک مبالغہ ایک ایسی کیفیت کا نام ہے جو کسی واقعے کی بنیادی صداقت کو متاثر کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی، بہر حال ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امریکہ کے ایماء پر ایران و اسرائیل کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہو چکا ہے، جس کی رُو سے وہ عربوں کے خلاف ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

اس الزام کی ایران کے سابق صدر جناب بنی صدر کے اُس انٹرویو سے بھی تصدیق ہوتی ہے جو ۲۰ اگست ۱۹۸۱ء کو امریکی ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ کیا گیا، مسٹر بنی صدر نے اپنے انٹرویو میں یہ حیرت انگیز انکشاف کیا کہ ایران اور اسرائیل کے درمیان تجارتی معاہدہ امام خمینی کے حکم پر میری نگرانی میں ہوا تھا اور اس معاہدے کے تحت کافی عرصے سے ایران کی مسلح افواج کے لئے اسرائیل اسلحہ اور گولہ بارود سپلائی کر رہا ہے ——— مبینہ معاہدے

کا انکشاف سب سے پہلے اس وقت ہوا، جب ۱۸ جولائی ۱۹۸۱ء کو سوویت یونین کی حدود میں "یارفین" نامی مقام پر ارجنٹائن کمپنی کا طیارہ سی ایل ۴۴ گرایا گیا، یہ طیارہ تل ابیب سے گولہ بارود اور امریکی ساخت کے فاضل پرزے لیکر تہران کے لئے بارہ میں سے تیسری پرواز پر تھا، ۲۸ اگست ۸۱ء کو نکوسیا میں حکومتِ قبرص کے ایک ترجمان نے بتایا کہ ارجنٹائن کا طیارہ سی ایل ۴۴ ۲ تیل لینے کے لئے ۱۷ جولائی کو لارنیکا کے ہوائی اڈے پر اترا تھا۔ یہ طیارہ معمول کی پرواز دائی، آر ۴۴ ۲ پر تھا، قبرص کے سرکاری ترجمان کے مطابق اس طیارے میں پچاس صندوق تھے جن کا وزن ۵۰، ۶۷ کلوگرام تھا اور اس پرواز کے کیپٹن کا نام سیکپر میفرٹی تھا۔

قبرصی حکومت کے ترجمان نے مزید بتایا کہ ۱۲ اگست ۸۱ء کو تل ابیب سے تہران اور ۱۳ اگست کو طلوعِ آفتاب سے قبل تہران سے تل ابیب جاتے ہوئے بھی ایک طیارہ لارنیکا میں اترا تھا، اس طیارے کے کیپٹن کا نام سیکپر کارڈیرد تھا۔

۲۲ جولائی کو ایران کی وزارتِ خارجہ نے یہ وضاحتی بیان جاری کیا کہ روس کے علاقے میں تل ابیب سے تہران آنے والے طیارے کے گرائے جانے کی خبر سفید جھوٹ ہے یہ خبر "اسلامی انقلاب" کے کسی دشمن اور مخصوص مفادات رکھنے والے ذہن کی اختراع ہے اور ارجنٹائن کے طیارے سے ایران کا کوئی تعلق نہیں، اس کا تعلق روس کی ایک حرکت سے ہے۔"

روس کی حرکت کیا تھی؟ یہ روس جانے یا اس کا رازدان، بہرحال ایرانی ترجمان کی زبان پر روس کا نام آیا تو اگلے روز اس نے بھی لب کشائی کی، اس کی لب کشائی میں گرہ کشائی بھی تھی، روسی ترجمان کے بیان کا ماحصل یہ تھا کہ ایران نے جو دعوے کئے ہیں، وہ درست نہیں، روس اس بات سے بے خبر نہیں کہ انقلابِ ایران کے خلاف بہت سے شوشے چھوڑے جاتے ہیں، تاہم یہ حقیقت ہے کہ روس میں ارجنٹائن کا جو طیارہ گرایا گیا، ایران کا اس سے براہِ راست تعلق موجود ہے،

روس کے بیان پر انقلابی ایران کا خاموش رہنا ایک غیر انقلابی رویہ سمجھا جاتا، چنانچہ ۲۷ جولائی کو قومی امور کے وزیر نے تہران میں ایک پریس کانفرنس طلب کی، جس میں جوابِ آں غزل کے طور پر ارشاد فرمایا کہ ایران کو بھی اس بات کا علم ہے کہ روس نے اپنے علاقے میں ایک طیارہ مار گرایا ہے، لیکن یہ بات درست نہیں کہ وہ طیارہ تل ابیب سے اسلحہ اور فاضل پرزے لا رہا تھا، روس نے اس طیارے کو تل ابیب سے تہران آتے ہوئے نہیں، بلکہ تہران سے تل ابیب جاتے ہوئے گرایا ہے، اس توضیح کا مفہوم ظاہر و باہر ہے۔

انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
انہی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی

قومی امور کے وزیر کی اس تقریرِ دلپذیر سے قوم خوش ہوئی یا نہ ہوئی، یہ بات تو قوم ہی جانتی ہے، البتہ بیرونی حلقوں کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ اسرائیل سے ایران کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور موجود ہے، کیونکہ وزیر موصوف جس بات کی تردید کرنے آئے تھے، شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی تائید کر گئے، حکومت کے ترجمان اخبار "کیہان انٹرنیشنل" کے نمائندے نے پارلیمنٹ کے سپیکر ہاشمی رفسنجانی سے وضاحت طلب کی تو انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ روس نے جس طیارے کو تباہ کیا ہے، وہ بلاشبہ ایران ہی آرہا تھا مگر یہ بات غلط ہے کہ اس طیارے میں اسلحہ اور فاضل پرزے موجود تھے۔"

ہاشمی رفسنجانی کی اس وضاحت کے بعد شاید بات دب جاتی، لیکن ۱۹ اگست کو ایران کے ناظم الامور محسن الموسوی نے ایک اخباری بیان میں یہ توجیہہ پیش کر دی کہ ایران نے کھلی منڈی سے اسلحہ خرید کر قبرص پہنچایا تھا، جہاں سے ارجنٹائن کے طیارے نے اسے تہران پہنچایا" —— مگر اس توجیہہ سے ان کا اپنا دل بھی مطمئن نہ ہو سکا، اس لئے ۲۴ اگست کو ایران کی خبر رساں ایجنسی "ارنا" کے حوالے سے ان کی دوسری توجیہہ سامنے آگئی، اس توجیہہ میں کہا گیا کہ اگر ایران نے اسرائیل سے اسلحہ خریدا ہی ہے تو اس کے ذمہ دار سابق

صدر مسٹر بنی صدر رہیں، کیونکہ جس وقت اسرائیل سے سودا طے پایا، اس وقت مسلح افواج کے سُپریم کمانڈر وُہی تھے، اور ان ہی کو اپنی مرضی سے اسلحہ خریدنے کا اختیار تھا"۔۔۔ معلوم نہیں کس کا شعر ہے، لیکن اس دلچسپ صورتِ حال پہ بالکل صادق آتا ہے۔

اپنی قسمت میں رہا ہائے برابر رونا
بدلا جس پہلو سے بھی نالاں کو نالاں نکلا

ایران اور اسرائیل کے درمیان ہونے والے مبینہ عرب دشمن معاہدے کی صداقت پر اگرچہ ایرانی ترجمانوں کی تضاد بیانی ہی بڑی وزنی دلیل ہے، لیکن اس معاہدے کو طشت ازبام کرنے کیلئے ضروری ہے کہ عالمی پریس کے چند مزید حوالے بھی پیش کر دیئے جائیں۔

"سنڈے ٹائمز" لندن نے ۲۶ جولائی ۸۱ء کو روس کے علاقے میں گرنے والے اسلحہ بردار طیارے کے بارے میں جو تفصیلات شائع کیں، ان کے مطابق جس شخص کو اسرائیلی اسلحہ ایران کے سپرد کرنا تھا وہ برطانیہ کا رہنے والا ہے اور اس کا نام سٹیورٹ میکفرڈی ہے، مسٹر میکفرڈی کو سوئٹزرلینڈ کے ایک ایجنٹ، اینڈریز جینے نے اس معاملہ میں شریک کیا تھا، ان دونوں نے ۱۲، ۱۴ اور ۱۷ جولائی کو اسرائیلی اسلحہ کی تین کھیپیں کامیابی کے ساتھ ایران پہنچا دی تھیں اور چوتھی کھیپ لیکر جا رہے تھے کہ روسی علاقے میں طیارہ مار گرایا گیا۔ اس اخبار نے اینڈریز جینے کے حوالے سے لکھا ہے کہ اسے یہ تو معلوم نہیں کہ جو اسلحہ اور فاضل پُرزے اسرائیل سے ایران پہنچائے گئے ان کی مقدار اور تعداد کیا ہے، لیکن اسرائیلی حکام نے بڑا زور دیا تھا کہ اسلحہ اور فاضل پُرزوں کی تمام کھیپیں جلد از جلد تل ابیب سے تہران پہنچا دی جائیں۔"

فرانس کے اخبار "لی فیگارو" اپنی ۲۷ جولائی کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ خمینی نے لندن کی اس کمپنی سے خفیہ طور پر رابطہ قائم کیا تھا جو اسرائیل سے روابط رکھنے میں بہت شہرت رکھتی ہے اور اسرائیل کے مفاد کے لئے کام بھی کرتی ہے، یہ کام اسی کمپنی کے ذریعے انجام

پہنچا، جرمنی کے جریدے "ڈرسپیگل" نے اُسی دن اور اُسی تاریخ کو اپنی رپورٹ میں لکھا کہ ایران کی "اسلامی جمہوریہ" نے اسلحہ کے حصول کے لئے ایک اور ذریعہ تلاش کر لیا ہے، یہ نیا ذریعہ کافی عرصے سے خمینی کی خدمت کر رہا ہے، ایران آئندہ یورپی ممالک کے راستے اسرائیلی ہتھیار اور فاضل پُرزے اسی وسیلے سے حاصل کرے گا۔"

ایران اور اسرائیل کے درمیان ہونے والا معاہدہ چونکہ انتہائی خفیہ تھا، اس لئے تل ابیب سے اسلحہ اور فاضل پرزوں کی ترسیل کے لئے قبرص کا راستہ ہی محفوظ ترین سمجھا گیا اور لارنیکا کا ہوائی اڈہ استعمال کرنے کے لئے قبرص سے اجازت لی گئی۔ ایران کے لئے اسرائیلی اسلحہ کی فراہمی کا مسئلہ عالمی پریس میں اس شدت سے اُبھرا کہ امریکی ٹیلی ویژن نٹورک اے بی سی نے ۲۰ اگست ۸۱ء کو اپنا جو سہ روزہ پروگرام شروع کیا اس میں بھی ایران، اسرائیل کے مابین اسلحہ کی خریداری کے سلسلے میں طے پانے والے سمجھوتے پر روشنی ڈالی گئی، اس پروگرام میں بتایا گیا کہ اسرائیل کافی عرصے سے ایران کو سامانِ جنگ فراہم کر رہا ہے، اس پروگرام میں یہ بھی بتایا گیا کہ امریکی ٹیلی ویژن کے نمائندوں نے جو سروے کیا ہے اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ایران کو اسرائیل کی طرف سے اسلحہ کی فراہمی کا کام سوئٹزرلینڈ کے ایک ایجنٹ کی مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے، اس ٹی وی پروگرام میں متعلقہ افراد کے نام اور اسرائیل سے بھیجی گئی اشیاء کی تفصیل کے علاوہ وہ دستاویز بھی دکھائی گئیں جن میں دونوں ملکوں کے درمیان رقوم کے لین دین کے اندراج تھے۔

امریکی ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے پروگرام میں یہ انکشاف بھی شامل تھا کہ ایران عراق جنگ سے پیشتر ستمبر ۱۹۸۰ء میں فرانس کے ایک فنی ماہر نے سرکاری دعوت پر ایران کا دورہ کیا تھا، پھر ستمبر کے آخر میں مزید ماہرین کو ایران کی وزارتِ جنگ، بحریہ اور فضائیہ کی ضروریات کا جائزہ لینے کے لئے مدعو کیا گیا۔ ان ماہرین نے اپنے دورے کے اختتام پر یہ رائے ظاہر کی کہ ایرانی فضائیہ میں اگرچہ ایف چار قسم کے طیاروں کی کمی نہیں، تاہم ان طیاروں

کو فوری طور پر سروس اور مرمت کی ضرورت ہے، ماہرین نے تجویز کیا کہ ایرانی فضائیہ کے بیڑے میں ایف چار قسم کے مزید طیارے شامل کئے جائیں۔

رپورٹ کے مطابق ماہرین کے جائزے کے بعد ایرانی حکومت کے نمائندوں نے فرانس جاکر اسرائیلی سفارتخانے سے رابطہ قائم کیا اور اس گفت و شنید کے نتیجے میں فرانس کے جنوب مغربی علاقے کے ایک ایئرپورٹ پر اکتوبر ۱۹۸۰ء میں ایران کو ایف چار قسم کے طیارے، آواز سے تیز رفتار اڑھائی سو طیاروں کے فاضل پرزے اور جدید ترین ماڈل کے پچاس سکارپین ٹینک اسرائیل نے مہیا کر دیئے، مزید براں اسرائیل نے ایران کو اطالوی بندرگاہ کے ذریعے ایم ۴۰ قسم کے ٹینکوں کے فاضل پرزے بھی بھاری مقدار میں مہیا کئے، یہ سامان تمام کا تمام لکسمبرگ کے جہاز "کارگولکس" میں ترجیحی بنیادوں پر لاد کر تہران پہنچایا گیا، اسی طرح اسرائیل نے کچھ سامان پرتگال کے راستے سے بھی ایران کو فراہم کیا۔ اس سامانِ جنگ کی قیمت کی ادائیگی زیورچ میں اسرائیل کے فوجی اتاشی کے ذریعے کی گئی، اسرائیل کو ادا کی جانے والی رقم کی پہلی قسط تین لاکھ ڈالر پر مشتمل تھی۔"

امریکی ٹیلی ویژن نٹ ورک اے بی سی کے اس پروگرام میں امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر کے پریس سیکرٹری جوڈی پویل، اسرائیل کے وزیر اعظم مسٹر بیگن اور ایران کے سابق صدر مسٹر بنی صدر کے انٹرویوز بھی پیش کئے گئے، صدر کارٹر کے پریس سیکرٹری نے بتایا کہ "جس زمانے میں وہ صدر کارٹر کے پریس سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے تھے، اسی زمانہ میں اسرائیل اور ایران کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ اس معاہدے کے بارے میں بڑی رازداری اور احتیاط برتی گئی تھی، امریکہ کو احساس تھا کہ ایران کو اسلحہ اور فاضل پرزوں کی سخت ضرورت ہے، اسی طرح یہ بات بھی امریکہ کے علم میں تھی کہ ایران اسرائیل سے حصول اسلحہ کی درخواست کر چکا ہے، چنانچہ کارٹر انتظامیہ نے ایران کی ضروریات کا احساس کرتے ہوئے اسرائیلی حکام سے سفارش کی جس پر حکومت اسرائیل نے اس معاملے پر ہمدردانہ غور

کی یقین دہانی کرائی تھی"۔

اسرائیلی وزیر اعظم نے اعتراف کیا کہ اسرائیل نے عرب دشمنی کی بنا پر ایران کو اسلحہ فراہم کرنے کا سمجھوتہ کیا ہے مگر اسرائیلی قانون انہیں اس سمجھوتے کی تفصیلات ظاہر کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے وہ کسی خبر کی تردید یا تائید کرنے کی پوزیشن میں نہیں"۔

ایران کے سابق صدر نے کہا کہ انہوں نے حکومتِ ایران کو اس معاہدے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ ایران کو اسرائیل سے اس قسم کا معاہدہ کرنے کے بجائے عربوں سے تعلقات استوار کرنے کی ضرورت ہے، لیکن امام خمینی نے ان کی بات نہ مانی اور ان کے حکم پر حکومتِ ایران نے اسرائیل سے معاہدہ کر لیا"۔

۱۲ اکتوبر ۸۰ء کو پیرس کے ایک جریدے "افریک ایشیے" نے اپنے نمائندہ خصوصی مقیم تہران کا جو مکتوب شائع کیا، اس میں یہ انکشاف کیا گیا تھا کہ اسرائیل کے سول اور فوجی ماہرین کا ایک وفد تین دن کے دورے پر تہران آیا، اس وفد کا مقصد ایران کی دفاعی ضروریات کا اندازہ لگانا تھا، تاکہ ایران کو اس کی ضرورت کے مطابق امریکی اور اسرائیلی ساخت کے فاضل پرزے اور دوسرا سامانِ جنگ فراہم کیا جا سکے"۔

۲ نومبر کو برطانیہ کے اخبار "آبزرور" میں بھی تہران کا ایک مکتوب شائع ہوا، اتفاق ملاحظہ فرمایئے کہ اس مکتوب میں بھی اسرائیلی اسلحہ کا ذکر تھا۔

مکتوب نگار نے لکھا ہے کہ عراق سے جنگ کے لئے اسرائیل نے ایران کو بندر عباس، چاہ بہار اور بوشہر کی بندرگاہوں کے ذریعے بھاری مقدار میں اسلحہ فراہم کیا ہے"۔

۳ نومبر کو مغربی جرمنی کے اخبار "ڈائی ویلٹ" میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اسرائیل نے ایران کو ایف چار طیارے اور دوسری جنگی مشینری کے فاضل پرزے فراہم کئے ہیں، خبر میں یہ تشریح بھی موجود ہے کہ اسرائیل نے یہ سامان بحری راستے سے ایران پہنچایا، اور ساتھ ہی اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ اسرائیل ایران کو سامانِ جنگ مہیا کرنے کا یہ سلسلہ

جاری رکھے گا۔"

ایران، اسرائیل معاہدے اور اسرائیل سے ایران اسلحہ کی مختلف راستوں سے منتقلی کے بارے میں پیرس کے جریدہ "الوطن العربی" "وی سی ڈی" اور "جان افریق" نے بھی علی الترتیب ۵، ۱۱، اور ۲۴ نومبر کی اشاعتوں میں انتہائی تفصیلی اور سنسنی خیز رپورٹیں شائع کیں، یہ رپورٹیں چونکہ بہت طویل ہیں، اس لئے ہم انہیں نظر انداز کر رہے ہیں، اسی طرح ۱۲ مارچ ۱۹۸۱ء کے کویتی اخبار "السیاسیۃ" اور ارجنٹائن کے اخبار "لا بریناً" اور "کرد شیا" کی اشاعت ۲۴ جولائی ۱۹۸۱ء کا بھی فقط حوالہ دینا کافی ہے۔

ایران اور اسرائیل کے اس خفیہ کاروبار کے بارے میں ان اخبارات نے بھی انتہائی فکر انگیز خبریں شائع کی ہیں، تاہم خبروں کے اس پس منظر میں تین حوالے مزید ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۵ جولائی ۱۹۸۱ء کو امریکی ٹیلی ویژن نیٹ ورک اے بی سی نے بتایا کہ اسرائیل اس باہمی سمجھوتے کے تحت ایران کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے، جو کافی عرصہ پہلے دونوں ملکوں کے درمیان طے پایا تھا، البتہ اس سمجھوتے پر سرگرمی سے عمل درآمد جولائی ۸۱ء کے پہلے ہفتے شروع ہوا، اسرائیل نے پہلے مرحلے میں ایران کو ایک کروڑ ڈالر کا جنگی سامان فراہم کیا تھا، مجموعی طور پر اب تک اسرائیل سے ایران کو دس کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر کا اسلحہ ملا ہے، اس سلسلے میں دونوں ملکوں کے درمیان فضائی رابطہ بھی قائم ہے۔

ایران، اسرائیل معاہدے کی خبر جب دنیا بھر میں پھیل گئی تو ۲۰ جولائی ۸۱ء کو اسرائیل کے رسالہ "معارف" نے بھی اس سلسلے میں ایک مختصر وضاحت کی، "معارف" لکھتا ہے کہ ایرانی حکومت نے اسرائیل سے براہِ راست اور مختلف ایجنسیوں کی وساطت سے مختلف النوع اسلحہ فراہم کرنے کی درخواست کی ہے اور بڑی مقدار میں فاضل پرزے بھی منگوائے ہیں۔" اس جریدے نے یہ صراحت بھی کی کہ ایران اور اسرائیل کے درمیان اسلحہ کی فراہمی کی بات چیت امریکہ کی طرف سے ایران کے لئے اسلحہ کی فروخت پر

پابندی سے بہت پہلے شروع ہو چکی تھی"۔

۲۹ جولائی ۱۹۸۱ء کو سوئٹزرلینڈ کے جریدہ "ٹربیون ڈی لازان" میں "ایران کے لئے اسرائیلی اسلحہ" کے عنوان سے ایک مکتوب شائع ہوا، اس مکتوب میں یہ مؤقف پیش کیا گیا ہے کہ ایران کے لئے اسرائیلی اسلحہ کی ترسیل کسی طرح بھی غیر قانونی کارروائی نہیں، تاہم اس میں دو باتیں غیر قانونی ہیں، ایک یہ کہ اس معاملے سے سوئٹزرلینڈ باخبر ہو گیا اور دوسری یہ کہ بعد ازاں اسرائیل، ایران سمجھوتے اور ایران کو مال فراہم کرنے کے سلسلے میں سوئٹزرلینڈ کا نام لیا جانے لگا، حالانکہ اس کا دونوں ملکوں کے معاملے سے کوئی تعلق نہیں"۔

دسمبر ۱۹۸۲ء کو ایران کے شہر تہران میں ہونے والی "سیرت کانفرنس" میں شرکت سے پہلے ہمارا ذاتی خیال یہی تھا کہ مغربی ذرائع ابلاغ نے ایران کے "اسلامی انقلاب" کی دشمنی میں اندھے ہو کر اس کے خلاف شوشے چھوڑنا اپنا وطیرہ بنالیا ہے، لیکن "سیرت کانفرنس" کے نام پر بلائی گئی اس سیاسی کانفرنس میں ہم نے اہلِ ایران کے جو رنگ ڈھنگ دیکھے، اہل علم کی جو باتیں سنیں، اپنے دائیں بائیں، گھومنے، پھرنے والوں کی جو وارداتیں دیکھیں اور شیریں زباں، شیریں دہن لوگوں کی زبانوں کے جو گھاؤ محسوس کئے ان سے ہماری پہلی بار آنکھیں کھلیں، ہمیں احساس ہوا کہ اہلِ مغرب کچھ اتنے زیادہ برے نہیں جتنے مشہور ہیں، اس انقلاب کے بارے میں جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں بڑی رعایت اور رواداری ہوتی ہے۔ انقلاب ایران پر اگر کھل کر گفتگو اور کس کر گرفت کی جائے تو انقلاب کا مفہوم ہی بدل جائے۔

انقلابِ ایران کیا ہے، کیسا ہے؟ —— ایران میں ہم سے بار ہا یہ سوال ہوا، ہم نے بار ہا جواب دیا، پھر سوال سنتے سنتے ہمیں بھی سوال کی سوجھی، ایک کمر بوس عمامہ دیکھ کر ہم نے بھی سوال داغ دیا، ہماری غرض یہ تھی کہ ہم اس کے سوال سے بچ جائیں، یہ توقع حسبِ توقع پوری ہو گئی مگر اس کا جو جواب سننا پڑا، وہ یہ تھا کہ

انقلابِ ایران شیعہ ہے نہ سنی، یہ صیہونی انقلاب ہے!!

انقلابِ ایران کا کوئی کتنا ہی اور کیسا ہی مخالف کیوں نہ ہو، یہ جواب دینا اور سہنا دونوں مشکل کام ہیں، ہم نے اس بزرگ کو نظرِ غضب سے دیکھا مگر ہماری نظر جھک گئی، ہمارا مخاطب کوہِ آتش بن چکا تھا ——— وہ بھڑک کر بولا، تم لوگ اندھے ہو، پاگل ہو، بے شعور ہو!!

اتنی بات تو تم بھی جانتے ہو یہ انقلاب سُنّی نہیں!

ہم نے دلچسپی لیتے ہوئے عرض کیا، جی ہاں جانتے ہیں!

ارشاد ہوا!

پھر شیعہ نقطۂ نظر سے بھی دیکھ لو —— شاہ کے خلاف تحریک میں مرنے والے شیعہ، انقلاب کے بعد مختلف الزامات میں مارے جانے والے شیعہ، پاسداروں کے ہاتھوں قتل ہونے والے شیعہ، مجاہدینِ خلق سے تعلق کے باعث موت سے ہم آغوش ہونے والے شیعہ، بنی صدر کی حمایت کے جُرم میں گولی کھانے والے شیعہ، محاذِ جنگ پہ شہید ہونے والے شیعہ، ——— ایرانی فوج شیعہ، عراقی فوج شیعہ، ملک کے اندر، ملک سے باہر تمام مرنے والے شیعہ! —— اب تک مرنے والوں کی تعداد لاکھوں میں ہے، یہ سارے کے سارے لوگ شیعہ ہیں ——— یہ کیسا اسلامی انقلاب ہے جو شیعہ قوم کی نسل مٹانے پر تُلا ہوا ہے؟ —— آیت اللہ شریعت مدار سامنے ہوتے تو شیعہ قوم کو بچا لیتے، لیکن وہ تو خود "جرم" حق گوئی کی سزا پا رہے ہیں، کوئی نہیں جانتا وہ کہاں ہیں کیسے ہیں؟!

ہم نے اس بزرگ سے گذارش کی کہ آپ کی تقریر سے صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے کہ انقلابِ ایران، انقلابِ شیعہ یا انقلابِ سُنّی نہیں، یہ دعوٰی تو اہلِ انقلاب نے کبھی نہیں کیا ——— ان کا دعوٰی یہ ہے کہ انقلابِ ایران، انقلابِ اسلامی ہے! آپ اس دعوے کی کس طرح تکذیب کرتے ہیں اور آپ کو خدا نے یہ اختیار کب دیا ہے کہ آپ

مسلمانوں کے "اسلامی انقلاب" کو "صیہونی انقلاب" کا نام دیں ؟

میر بات کاٹ کر بولے ——— تم بڑے چغد آدمی ہو!

"ایران کے قائد انقلاب کے کام کو تمام انبیاء کے کام پر ترجیح دینا، خدا کے نام کے بعد صرف ان کا نام لینے کی تعلیم دینا، اقوالِ رسول اور اقوالِ امیر علیہ السلام کی جگہ قائدِ انقلاب کے اقوال لکھنا، پڑھنا، بولنا، سننا اور سُنانا ——— کلمۂ اسلام کے دوسرے جزو کو مٹا کر پیغمبر اسلام کے نامِ نامی اسمِ گرامی کی جگہ قائد انقلاب کا نام لینا اور اس طرح ایک نیا کلمۂ اسلام وضع کرنا، اپنے سوا ساری دنیا کے مسلمانوں کو کافر سمجھنا، عالمِ اسلام کے موجودہ نقشے کو بدلنے کے لئے جدوجہد کرنا، کعبۃ اللہ پر قبضے کے لئے لوگوں کو تیار کرنا اور اس عمل کو جہاد کا نام دینا، تمام مسلم سربراہانِ حکومت کو کافر قرار دے کر ان کا تختہ الٹنے اور ان کی حکومتوں کو ختم کرنے کے لئے قوم کو آمادہ کرنا ——— مسجدوں میں کیمرے نصب کرنا، تصویریں اتارنا اور اتروانا، مسجدوں میں جوتوں سمیت جانا اور محرابِ مسجد میں تصویریں بنانا یا چسپاں کرنا، مسجدوں میں بیٹھ کر سگریٹ نوشی کرنا، شہیدوں کے قبرستان "بہشتِ زہرا" کو تصویروں سے ڈھانپ کر سٹوڈیو میں تبدیل کرنا، ہوٹلوں میں مردوں کے کمرے صاف کرنے اور بستر بچھانے پر عورتوں کو مامور کرنا، اپنے مخالفوں کو کافر کہہ کر ان کی قبریں اکھاڑنا اور لاشوں کو غیر مسلموں کے قبرستان میں ڈالنا، اختلاف رائے کا اظہار کرنے والوں کو مقدمہ چلائے بغیر گولی مار دینا ——— نماز میں امام کا مقتدیوں سے الگ ہو کر مسلح افراد کی نگرانی میں قیام کرنا، امام کی حفاظت کرنے والوں کے اس عمل کو نماز کا بدل قرار دے کر ان کو خدا کے فرض سے سبکدوش کرنا، امام کا ایسے شخص کی آواز پر رکوع سجود کرنا جو نماز میں شریک نہیں ہوتا، شہریوں کا رزق درباری مولویوں کے ہاتھ میں دے دینا، اشیائے ضرورت کی راشن بندی کر کے عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بازاروں میں لانا اور قطاروں میں کھڑا کرنا، زنا جیسی قبیح بدکاری کو مذہبی تحفظ

دینا، ولدیت کی جگہ اسم مادر کو لازم قرار دینا، کم سن اور معصوم بچوں کو قتل کرنا، جھوٹے الزامات اور تہمتیں تراش کر انسانوں کو زندگی سے محروم کرنا، نمازیوں کی جماعت پر صرف اس لئے گولی چلانا کہ وہ سرکاری مولوی کی اقتداء میں کیوں نہیں کھڑے ہوئے، آیت اللہ شریعت مدار جیسے امامِ برحق کو "منافق" کہہ کر نظر بند کرنا، قائد انقلاب کی تصویر کی پوجا کرنا، ان کے سامنے ان کے نام کا کلمہ پڑھنا ــــــــ اگر یہ اسلام ہے تو تم بتاؤ ضدِ اسلام کیا ہے؟ یہ اسلامی انقلاب ہے تو صہیونی انقلاب کیا ہوتا ہے؟"

نہ جانے ان کی تقریر اور میری سماعت کا سلسلہ کے دیر تک جاری رہا۔ بات یہاں تک پہنچی تھی کہ کانفرنس کا پہلا سیشن شروع ہوگیا، وہ ہال میں چلے گئے اور میں حال میں ڈوب گیا۔

جس کو خبر نہیں اُسے جوش و خروش ہے
جو پا گیا ہے راز وہ گم ہے خموش ہے

تہران کانفرنس کو "سیرۃ کانفرنس" کا عنوان ملا تھا، دعوت نامے بھی اسی عنوان سے جاری ہوئے تھے مگر کانفرنس شروع ہوئی تو "سیرۃ" کا لفظ کہیں نظر نہ آیا، آرائشی، زیبائشی اور نمائشی بینر دیکھے تو اُن پر "کنگرۂ جہانی ائمہ جمعہ و جماعات" لکھا دکھائی دیا، یہ کانفرنس "عالمی سیرت کانفرنس" کی سطح سے اتر کر عالمی خطیبوں اور اماموں کی کانفرنس بن گئی، کانفرنس کے انتظامات اور ظاہری علامات سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا "کانفرنس ہذا" اماموں کی نہیں، "عماموں" کی ہے، خیال آیا کہ نظر کے ترازو میں جو چیز کم تر نظر آئے، دل کے ترازو میں اسے تول لینے میں کیا حرج ہے، دل کے تختِ عدالت سے فیصلہ صادر ہوا

مُسافر یہ تیرا نشیمن نہیں ہے

۲۸ دسمبر کو کانفرنس کا آغاز ہوا، پہلا سیشن، ٹیسٹ کیس تھا، بولنے والوں کی زبانیں بولتی رہیں، سننے والوں کے کان سنتے، دل دھڑکتے اور سینے پھڑکتے رہے،

مولوی لاکھ سادہ مخلوق سہی، لیکن اگلے زمانے کے حضرت میر سے زیادہ نہیں، ایرانی مولیانِ کرام نے آنے والے مقررین کے چہروں کی سختی، درشتی اور کرختگی سے اندازہ لگا لیا کہ ان کے سینوں میں ایسے طوفان چھپے ہیں جو کانفرنس اور اہل کانفرنس ہر دو کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر کھلے اجلاس بند اور بند اجلاس کھلے قرار دیئے گئے، اب فیصلہ ہوا کہ بند اجلاس میں "کھلی کانفرنس" کے ذریعے پیش کی جانے والی قرار دادوں پر بحث ہوگی، اس فیصلے کے تحت بند کمروں میں "قرار داد کمیٹیاں" کام کرنے لگ گیئں، ہماری قرار داد کمیٹی کے صدر، جناب آیت اللہ طاہری اور نائب صدر، مولانا سید محمد عبد القادر آزاد مقرر ہوئے، جب کہ سیکرٹری کے فرائض میرے حصّے میں آئے۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی وہ ترا ناتواں اٹھا لایا

قرار داد کمیٹیوں کا مقصدِ قیام و قرار بظاہر کانفرنس میں پیش کی جانے والی قرار دادوں پر بحث و نظر تھا، بند کمرے میں جاکر معلوم ہوا، ایسی کوئی بات نہیں، بحث کی گنجائش ہے نہ نظر کی ضرورت! منتظمین کانفرنس مختلف موضوعات پر سوال و جواب کے ذریعے صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ آنے والے مقررین میں کون کس نقطۂ نظر کا حامی ہے، اس طرح وہ کانفرنس کے مقررین کا انتخاب کرنا چاہتے تھے، جن حضرات نے ان کمیٹیوں میں ان کے مقصد کی بات کہی، انہیں کانفرنس ہال میں تقریر کرنے کا موقع دیا گیا اور جنہوں نے دل کی بات زبان پر لانے کا حوصلہ کیا، انہیں مقررین کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔ ہماری کمیٹی کے سامنے نکتہ بحث تھا: "اتحادِ اُمت"— سب سے پہلے صدر مذاکرہ آیت اللہ طاہری کی طرف سے مولانا عبد القادر آزاد کو دعوتِ سخن دی گئی، مولانا آزاد نے تعمیلِ ارشاد میں "اتحاد امت" کے لئے چھ نکات پیش کئے:۔

"اتحاد صرف ہماری اور آپ ہی کی ضرورت نہیں، یہ بات زیرِ بحث عنوان ہی سے ظاہر

ہے، کہ اتحاد پوری امت کی ضرورت ہے اور امت عملی اتحاد کے بغیر دنیا کے سٹیج پر اپنا تاریخی کردار ادا نہیں کر سکتی! اتحاد کی عملی صورتیں کیا ہیں؟ اس سلسلے میں اس وقت میرے پیش نظر چھ نکات ہیں۔ ان نکات پر اتحاد کی جو عمارت کھڑی کی جائے گی وہ مضبوط، دیرپا اور خوشنما ہوگی۔

(۱) امام خمینی کے بارے میں ہمیں اور پوری دنیا کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ وہ امام امت ہیں، ہمیں امت کے مشترکہ امام کی ذات پر اعتراض نہیں، اعتماد ہے، لیکن جہاں تک پوری مسلم دنیا کا تعلق ہے، وہ آنکھیں بند کر کے ان کی امامت پر متفق نہیں ہو سکتی، جب تک سوادِ اعظم اہل سنت کو اس بات کا یقین نہ آجائے کہ امام خمینیؒ ان کے اسلاف و اکابر کے بارے میں مثبت اندازِ فکر کے حامل ہیں، بنابریں لازم ہے کہ امام خمینی مجتہد کی حیثیت سے اعلان کریں کہ ان کے نزدیک خلفاء ثلاثہ ابوبکر، عمر و عثمان رضی اللہ عنہم ایسے ہی بلند پایہ مسلمان ہیں، جیسے حضرت علی المرتضیٰ شیر خدا ہیں۔

(۲) ایران اسلامی انقلاب کا علمبردار ہے اور قائد انقلاب امام امت ہونے کے دعویدار ہیں، لیکن دستورِ ایران میں سربراہِ مملکت کے لئے شیعہ عقیدے کا حامل ہونے کی شرط لگائی گئی ہے، ظاہر ہے کہ "امت" فقط شیعہ کا نام نہیں، "امت" شیعہ، سنی اور دوسرے مسلم فرقوں کے مجموعے کا نام ہے، اس لئے ضروری ہے کہ دستور میں شیعہ کی جگہ "مسلم" کا لفظ درج کیا جائے، جیسا کہ دستورِ پاکستان میں ہے۔

(۳) یہ افسوسناک بات ہمارے علم میں آئی ہے کہ تہران کی کم و بیش ستر لاکھ کی آبادی میں جہاں، عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں، سکھوں اور آتش پرستوں کی درجنوں عبادت گاہیں موجود ہیں، وہاں سنی مسلمانوں کی ایک مسجد بھی نہیں اور نہ انہیں مسجد بنانے کی اجازت ہے، میرے خیال میں یہ طرزِ عمل ایک امت کو دو سمتوں میں چلانے کا باعث ہے، امت کے ایک حصے کو عبادت گاہیں بنانے کی اجازت ہو، ایک

کو نہ ہو، اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ جس طبقے کو عبادت گاہ بنانے کی اجازت نہیں، ریاست اُسے خارج از ملت سمجھتی ہے، میں تجویز کرتا ہوں کہ سُنّی مسلمانوں کو سرکاری خرچ پر مسجد بنا کر دی جائے، حکومت چاہے تو وہاں اپنی پسند کا سنّی امام مقرر کر سکتی ہے، میرے خیال میں اس طرح امت کے یہ دو طبقے ایک دوسرے کے قریب آئیں گے، ان کے درمیان محبت، رواداری اور بھائی چارے کی فضا پیدا ہو گی۔

(۴) اگر یہ ممکن نہیں ہے اور ریاست ضرری سمجھتی ہے کہ تمام مسلمان ایک ساتھ ایک ہی امام کی اقتدار میں نماز پڑھیں تو ہمیں اس پر بھی اعتراض نہیں، ہم اس کا خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن اس کے لئے مناسب طریق عمل یہ ہے کہ ایک مہینے میں تین ہفتے شیعہ عالم امام جمعہ کے فرائض انجام دے اور ایک جمعہ سنی عالم کی اقتدار میں پڑھا جائے۔

(۵) میری معلومات کے مطابق سرکاری اعداد وشمار کی رو سے ایران میں سنی مسلمان ۲۵ فیصد اور غیر سرکاری اعداد وشمار کے لحاظ سے ۳۲ فیصد ہیں، مجھے اس سے بحث نہیں کہ ان کی تعداد کتنی ہے؟ اصل تعداد ان اعداد وشمار سے کم یا زیادہ بھی ہو سکتی ہے، اتحاد کا تقاضا ہے کہ پارلیمنٹ میں اور دوسرے محکموں میں سنی مسلمانوں کی تعداد کے مطابق انہیں نمائندگی دی جائے، یہ اقدام شیعہ سنی اتحاد کے لئے ممد ومعاون ثابت ہو گا۔

(۶) عالم اسلام کے تمام ملکوں کے دینی اور عصری علوم کے ماہرین کا انتخاب کر کے ان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی جائے، جو مسلم دنیا کے اتحاد کے لئے کوشش کرے، میرے خیال میں اس طرح مسلم ممالک کو ایک دوسرے کے قریب آنے کا موقع ملے گا۔

مولانا آزاد کے بعد مخدوم زادہ قاضی اسرار الحق کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی، حضرت قاضی نے مولانا آزاد کی تائید پر اکتفا کیا، مولانا آزاد کے جوہرِ لسانی اور قاضی اسرار کی تائید زبانی کے بعد جناب آیت اللہ طاہری نے اپنے مؤقف کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ "اصحابِ رسولؐ بالخصوص خلفاء ثلاثہ کے بارے میں ہمارے دل صاف ہیں، حضرت

امیر علیہ السلام ان کی اقتداء میں نمازیں پڑھتے رہے ہیں، وہ اصحاب ثلاثہ کو مسلمان سمجھتے ہوئے ان کے پیچھے نمازیں پڑھتے تھے، اس لئے اصحابِ ثلاثہ کے بارے میں غلط سوچ اور غلط گفتگو کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یہ اس کی ذاتی جہالت ہے، اس جہالت کو اہل تشیع کی طرف منسوب کرنا درست نہیں، جہاں تک تہران میں اہل تسنن کو مسجد کی اجازت دینے کا تعلق ہے تو ہمارے خیال میں ایسا کرنا اتحاد کے منافی ہے، اتحاد کا تقاضا ہے کہ تمام مسلمان ایک مقام پر ایک امام کی اقتداء میں نماز پڑھیں، یہی وجہ ہے کہ ہم نے اہل سنت کو الگ مسجد بنانے کی اجازت نہیں دی، تاہم مولانا آزاد کی تجاویز پر سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔ اس وقت ہم نے اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے کہ امت کے ان دو طبقات سے اختلاف کو ختم کر کے اتحادِ کامل کے لئے کس طرح تیار کیا جا سکتا ہے؟

اس کے ساتھ ہی جناب صدر نے مجھے حکم دیا کہ میں اس سوال کا جواب دوں!

مجھ سے پہلے بہت کچھ کہا اور سنا جا چکا تھا، مجھے اپنی مختصر تمنا کے لئے اب کسی تمہیدِ طولانی کی ضرورت نہیں تھی، لیکن "اتحادِ اُمت" کے طے شدہ موضوع میں "خاتمہ اختلاف" کا ضمنی سوال، مرکزی سوال کے طور پر پیش کیا گیا تو نئے سوال پر کہنے کو نئی بات مل گئی، میری معروضات کا خلاصہ یہ تھا:-

"صدرِ محترم نے فرمایا ہے کہ "اختلافِ اُمت" کیسے ختم کیا جائے؟ اگر "امت" سے مراد شیعہ اور سنّی ہیں، "اختلاف" سے مراد ان کا نظریاتی تصادم ہے تو میرے نزدیک سوال کی صحت ہی محل نظر ہے، اس قدر انوکھا سوال ہم سے آج تک کسی نے نہیں کیا، اگر کیا ہے تو کم از کم میں نے نہیں سنا، کتنے تعجب کی بات ہے کہ اختلاف کا خواہش مند عدمِ اختلاف کے حامل سے پوچھتا ہے کہ اختلاف کیسے ختم ہو؟ جتنی زحمت سوال کے الفاظ ادا کرنے میں ہوتی ہے اتنی زحمت اختلاف ختم کرنے میں ہر گز نہیں ہوتی، یہ پوچھنے کی بات نہیں کرنے کا کام ہے

جس روز یا جس لمحے آپ یہ کام کریں گے، اختلاف خود بخود ختم ہو جائے گا، تاہم آپ کے سوال پر سوال ہے اور یہ سوال ہے کہ کس کو کس سے اختلاف ہے؟ "اختلاف" کا سوال اٹھانے والے کو یا مخاطب کو؟

میں صدر محترم سے معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ آپ سائل ہیں ہم مجیب! اختلاف کی حقیقت صرف اسی قدر ہے کہ سائل کو اختلاف ہے، مجیب کو کوئی اختلاف نہیں، آپ کو ہم سے جو اختلاف ہے اس کا صدیوں پر محیط ایک طویل تاریخی پس منظر ہے، آپ چاہیں تو صدیوں کے اس اختلاف کو لمحوں میں ختم کر سکتے ہیں! ہم صرف ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ کو نہیں مانتے، ہم عباسؓ و علیؓ اور حسنینؓ کو بھی مانتے ہیں، ہم سب کے ماننے والے ہیں، ہمیں آپ سے کیا اختلاف ہے؟ صرف یہی کہ آپ سب کو ماننا شروع کر دیں، اختلاف ختم ہو جائے گا ——— اور ابھی ابھی جیسا کہ آپ نے حضرت امیرؓ کے حوالے سے سب کو ماننے کی بات کی ہے۔ میں اس جذبۂ خیر کا خیر مقدم کرتا ہوں، جو بات آپ زبان سے کہتے ہیں، وہی قلم سے لکھ دیں تو میرے ملک کے آٹھ کروڑ مسلمان آپ کے رضا کار بن جائیں گے، اس لئے یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے کہ اختلاف ختم ہو یا نہ ہو اور ہو تو کیسے ہو؟

ویسے میرا خیال ہے کہ اصل بات اختلاف کے خاتمے کی نہیں، مخالفت کے خاتمے کی ہے، آپ ہمارے بڑوں سے اختلاف کرتے ہیں اور ہم آپ کے اس اختلاف سے اختلاف کرتے ہیں، آپ کے اختلاف کا باعث مخالفت ہے، ہمارے اختلاف کا سبب محض اختلاف!

اختلاف کرنا جرم نہیں، مخالفت کرنا جرم ہے، ہماری آپ کی مشترکہ ضرورت اختلاف کا خاتمہ نہیں، یہ تو فریقین کی پہچان ہے، ہماری مشترکہ ضرورت مخالفت کا خاتمہ ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کے بانی آپ ہیں ——— اب اگر اسے آپ ختم کرنا چاہتے ہیں، تو سو

بسم اللہ ـــــــ چشمِ ماروشن دلِ ماشاد !

باتیں تو اور بھی ہوئیں، لیکن ان کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں، صدرِ محترم نے ازرہِ شفقت فرمایا کہ یہ اس سیشن کی سب سے بہتر تقریر ہے، تقریر بہتر تھی یا ابتر، نتیجہ خیز بہرحال نہیں تھی، جہاں سوال بے مقصد، جواب بے معنی، مقصدیت عنقا، معنویت مفقود اور محض تبادلہ الفاظ یا تکرار زباں ہو، وہاں نتیجہ ـــ صفر! صفر ضرب صفر ـــ صفر!

اس سیشن کے آخری مقرر گوجرانوالہ کے اہل حدیث عالم مولانا بشیر الرحمٰن مستحسن تھے، مولانا مستحسن بڑی مستحب قسم کی چیز ہیں، علم محیط اور جسم بسیط کے مالک، ان کا اندازِ تکلّم جدّتِ آلود اور گفت گو رت ہوتی ہے۔

فرمانے لگے!

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے، وہ قابل قدر ضرور ہے، قابل عمل نہیں، اختلاف ختم کرنا ضروری ہے مگر اختلاف ختم کرنے کے لئے اسباب اختلاف کو مٹانا ہوگا، فریقین کی جو کتب قابل اعتراض ہیں، ان کی موجودگی، اختلاف کی بھٹی کو تیز تر کر رہی ہے، کیوں نہ ہم اِن اسباب ہی کو ختم کر دیں ـــ ؟ اگر آپ صدق دل سے اتحاد چاہتے ہیں تو اُن تمام روایات کو جلانا ہوگا جو ایک دوسرے کی دلآزاری کا سبب ہیں، ہم "بخاری" کو آگ میں ڈالتے ہیں، آپ "اصولِ کافی" کو نذرِ آتش کریں" آپ اپنی فقہہ صاف کریں، ہم اپنی فقہ صاف کر دیں گے"

ممکن ہے اس تجویز پر ہر چیز کا صفایا ہو جاتا کہ مولانا آزاد نے مداخلت کر کے بخاری اور اصول کافی کو نذرِ آتش ہونے سے بچا لیا۔

دوسرے سیشن میں صاحبزادہ سعید الرحمٰن احمد نے تقریر کی اور خوب کی۔

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں تھا

مولانا نثار احمد اور ان کے رفقاء انگلش سیشن میں تھے، ان علماء کرام نے علمی، سیاسی اور معاشی امور سے متعلق بہت سی تجاویز پیش کیں، علماء کرام کے اس دھڑے میں گوجرانوالہ کے مولانا حبیب الرحمٰن بھی تھے، جو ایک روشن خیال، سنجیدہ فکر، عالی ظرف، وضع دار اور بلند پایہ عالم ہیں، وہ کسی مسئلے پر بات کرنے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتے دوستوں کی آراء معلوم کرتے، ان آراء کو نقد و نظر کی ترازو میں تولتے اور اس کے بعد اس مسئلے کو اجلاس میں پیش کرتے تھے، یہ بات ہمارے علم میں آئی کہ "قرارداد کمیٹی" نے ان کی بیشتر باتوں کو سنجیدہ غور و فکر کی متقاضی قرار دیا ہے۔

میں نے اس گروپ کے ونگ کمانڈر مولانا نثار احمد سے استفسار کیا کہ ایران کے موجودہ انقلاب کو بہتر یا مؤثر بنانے کے لئے ان کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟ مولانا نثار احمد نے کہا:۔

۱۔ اقامتِ دین کا کام کرنے والی اور سیکولر نظریات کی حامل جماعتوں کی سوچ میں ہمیشہ کھلا اور واضح تضاد رہا ہے، کسی ہنگامی سیاسی مسئلے پر دینی اور لادینی نظریات کی حامل جماعتوں کے مابین وقتی اور ہنگامی اتحاد تو ہو سکتا ہے، لیکن دائمی اتحاد پہلے کبھی ہوا اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، انقلاب ایران کی پشت پر ایک دینی قوت ہے، لیکن اس دینی قوت نے نظام حکومت چلانے کے لئے تودہ پارٹی سے جو اتحاد کیا ہے اس کی کوئی توجیہہ میری سمجھ میں نہیں آتی، اگر انقلاب ایران محض ایک انقلاب ہوتا تو دینی اور لادینی قوتوں کا اتحاد سمجھ آنے والی بات تھی، لیکن انقلابِ ایران اگر اسلامی انقلاب ہے تو اس انقلاب کی گاڑی کو تودہ پارٹی کے انجن سے نہیں چلایا جا سکتا، جس گاڑی کو آپ کعبہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں اس گاڑی کا ڈرائیور بہر حال ایسا ہونا چاہیئے جو کعبے کا راستہ جانتا ہو، یہاں گاڑی کو کعبے کی طرف لیجانے کا اعلان ہوا مگر اس کا ڈرائیور ایسے شخص کو مقرر کیا گیا ہے جو ساری عمر روسی ترکستان کا سفر کرتا رہا ہے، اور کعبے کا راستہ اس نے ایک بار بھی نہیں دیکھا

اور نہ ہی وہ اس راستے پر چلنا چاہتا ہے ــــــ اسلامی انقلاب میں یہ ایک عملی تضاد ہے جسے ختم کرنا ضروری ہے۔

۲۔ عالم اسلام پہلے ہی اختلاف کے جال میں الجھا ہوا ہے، جب کہ اس کے مسائل کا حل اتحاد ہے، ان حالات میں ایران اور عراق کے درمیان ہونیوالی جنگ صرف دو مسلم ملکوں کے لئے نہیں، تمام عالم اسلام کے لئے نقصان دہ ہے، امہ کمیٹی کے سربراہ اور دنیا بھر کے درد دل رکھنے والے مسلمان چاہتے ہیں کہ دونوں ملک جنگ بند کر کے اپنے ملک کے مسائل کی طرف توجہ دیں، لیکن اس بارے میں ایران کی پالیسی انتہا پسندی کی مظہر ہے، یہ درست ہے کہ اس جنگ میں ایران کا بہت نقصان ہوا ہے مگر یہ نقصان اس نقصان سے بہت کم ہے جو جنگ جاری رہنے کی صورت میں ہوگا، اس لئے انقلابی حکومت کو ایران، عراق کے عوام اور عالم اسلام کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر جنگ بندی کو قبول کر لینا چاہئے، میرے خیال میں جنگ کو طول دینا کسی طرح بھی روا نہیں۔

۳۔ انقلابِ ایران کے بعد قائدین انقلاب کی سوچ میں یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کہ وہ اپنی تحریک کے سوا دنیا کی کسی تحریک کو اسلامی تحریک سمجھنے اور کہنے کے لئے تیار نہیں، ان کے اس فتوے کی زد میں وہ تحریکیں بھی آچکی ہیں، جنہوں نے انقلاب سے پہلے ان کی سیاسی اور اخلاقی مدد کی تھی، یہ حضرات کسی ملک اور تحریک کی مخالفت کو ہم معنی سمجھتے ہیں حالانکہ دونوں باتوں میں فرق ہے، کسی بھی اسلامی ملک کی مخالفت ایران کے لئے سُودمند نہیں، لیکن خاص طور پر کسی اسلامی تحریک کی مخالفت تو اپنے پاؤں پر کلہاڑا چلانے کے مترادف ہے کسی ملک کی مخالفت سے تو شاید ایران کو زیادہ نقصان نہ پہنچے لیکن عالم اسلام میں چلنے والی تحریکوں کی مخالفت سے اسے ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کے لئے تیار ہوں کہ عملی جنگ جو عراق سے جاری ہے۔ ایران کے لئے اس جنگ میں ہونے والے نقصان کا ازالہ ممکن ہے مگر اسلامی تحریکوں کی مخالفت

سے اُسے جو نقصان پہنچے گا اس کا ازالہ ممکن نہیں ہوگا، اس لئے قائدین انقلاب کو وسعت نظری سے کام لیتے ہوئے دوسری تحریکوں کو بھی اچھی نظر سے دیکھنا چاہیئے، یہ عمل اس کے کام اور نام کو عظمت بخشے گا۔

۴ - اہل انقلاب۔ اسلام کے حق میں مخلص ہیں تو انہیں شیعیت پر تعصب کا مظاہرہ ترک کر کے تمام مسلمانوں کو انقلاب کا حصہ سمجھنا ہوگا اور شیعہ مسلک سے اختلاف رکھنے والوں کو وہی حقوق دینے ہوں گے جو شیعہ مسلمانوں کو حاصل ہیں۔ اس سلسلے میں تہران میں سُنّی مسلمانوں کو مسجد کے لئے جگہ دینا ایک اچھا اقدام ہوگا اور اس کے نتائج انقلاب کے لئے انتہائی خوشگوار ہوں گے۔

دو روز بعد کانفرنس ہال کی رونق دوبارہ لوٹ آئی مگر بند کمروں کی "ہدایات" نے کھلے اجلاس میں کھلی باتوں سے روکے رکھا۔ تاہم سوالات کرنے سے بیشتر حضرات باز نہ رہ سکے تھوڑے تھوڑے وقفے بعد سٹیج سے "اجتماعی صلوٰۃ برامام خمینی" کی آواز بلند ہوتی اور اس کے ساتھ ہی صدر گرامی کے سامنے دو چار "رُقعے" پہنچ جاتے۔ ان رقعوں کی رفتار بڑھی تو جناب آیت اللہ طاہری نے وضاحت فرمائی۔

"بہت سے محترم علمائے نے سوال کیا ہے کہ جب کسی مقرر کی تقریر کے دوران امام خمینی کا نام آتا ہے تو ان پر درود پڑھا جاتا ہے، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی آنے پر یہاں ایک بار بھی درود نہیں پڑھا گیا۔ کیا امام خمینی جناب رسالت مآبؐ کے مقام پر فائز ہیں اور پیغمبر کائنات اپنے مقام رفیع پہ فائز نہیں رہے؟"

جناب آیت اللہ طاہری نے سوالات کا ماحصل پیش کر کے ارشاد فرمایا۔

"امام خمینی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی ونسبی فرزند ہیں، اس لئے ان کا نام آنے پر جو درود پڑھا جاتا ہے، وہ درحقیقت پیغمبر کائناتؐ ہی کی شان میں ہوتا ہے یہ درود چونکہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات گرامی کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے

آپؐ کے نام پر اس کا اعادہ ضروری نہیں"۔

آیت اللہ طاہری نے یہ نہیں بتایا کہ اگر یہ درود پیغمبرؐ ہی کے لئے پڑھا جاتا ہے تو پیغمبرؐ کا نام آنے پر کیوں نہیں پڑھا جاتا اور غیر پیغمبرؐ کے نام پر کیوں پڑھا جاتا ہے ؟ اور اگر غیر پیغمبرؐ پر درود پڑھ کر پیغمبرؐ کو بالطبع مراد لیا جاتا ہے تو پیغمبرؐ پر درود پڑھ کر پیغمبرؐ کی اولاد میں شامل غیر پیغمبرؐ کو بالطبع مراد کیوں نہیں لیا جا سکتا ؟

اسی طرح حضرت طاہری نے یہ نکتہ بھی تشنۂ وضاحت چھوڑ دیا کہ اگر پیغمبرؐ اور اولادِ پیغمبر کا ذکر ایک ساتھ ہو رہا ہو تو درود پڑھنے کے لئے پیغمبرؐ کے مقابلے میں غیر پیغمبرؐ کو کس اصول کے تحت قابلِ ترجیح سمجھا جائے گا ـــــــ اور انہوں نے یہ بات بتانے سے بھی گریز کیا کہ غیر پیغمبر پر اسلام کے کس قاعدے کے تحت درود پڑھنا لازم ہے ؟ شاید علماءِ ایران نے "درود" اور "سلام" کو ہم معنی سمجھ کر یہ نتیجہ اخذ کیا ہو کہ "سلام" ہر مسلمان پر ہوتا ہے، لہٰذا "درود" بھی ہر مسلمان پر ہو سکتا ہے۔ اگر نکتۂ جواز یہی ہے تو جو صفت انہوں نے پیغمبر کی صفات سے خارج کر کے امام خمینی کی صفات میں شامل کی ہے، اس صفت کو کوئی بھی شخص کسی بھی وقت امام خمینی کی صفات سے نکال کر کسی دوسری شخصیت کی صفات میں شامل کر سکتا ہے، اس طرح درودِ پاک مومن کی دعا کے بجائے بچوں کا کھیل بن جائے گا اور یہ کھیل "اسلامی انقلاب" کے میدان میں کھیلنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

اس گلستاں میں نہیں حد سے گزرنا اچھا
ناز بھی کر تو باندازۂ رعنائی کر

کانفرنس ہال سے نکلے تو اطلاع ملی، نمازِ عشاء کے بعد علماءِ اردو کا اجلاس ہوگا جس میں صرف ہندوستان اور پاکستان کے علماء شریک ہوں گے، بیالیس ملکوں کے علماء میں سے صرف دو ممالک کے علماءِ اردو کا اجلاس، ایسے لگا، جیسے اس کے مجوزہ محرک ہمارے بابائے اردو ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ہیں، ہم نے اس کی حکمت پہ بہت غور کیا، لیکن کوئی غایت سمجھ نہ آئی،

یہی تجسس شرکت کو عدم شرکت پہ ترجیح دینے کا سبب بنا، وقت مقررہ پر مقام معین پہ پہنچے تو ایک نئے چہرے پہ نظر پڑی، یہ آیت اللہ منتظری کے نمائندے آقائے حسن تھے، علماء اردو کو ان کی خواہش پہ جمع کیا تھا آقائے حسن نے تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"ہم ایرانی موسیٰ بالعصا ہیں اور آپ موسیٰ بغیر عصا ! موسیٰ بالعصا پیغمبر ہوتا ہے اور موسیٰ بغیر عصا کچھ نہیں ہوتا۔ ہمارے پاس ڈنڈا تھا، ہم نے شاہ کو اس ڈنڈے سے مار کر بھگا دیا۔ آپ کے پاس ڈنڈا نہیں لہٰذا آپ حکمرانوں کے رحم و کرم پر ہیں، حکمران آپ کو جس طرح چاہیں اور جس طرف چاہیں، بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتے پھریں ——— آپ کو یہاں جمع کرنے کی غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کو بتایا جائے، اقتدار کے اصل وارث آپ ہیں، چونکہ آپ سب ہمارے بھائی ہیں، اس لئے آپ کی مدد و رہنمائی ہمارا فرض ہے۔ آپ بھی عصا اٹھائیں اور ظالم حکمرانوں کے سر پہ ضرب لگا کر پاش پاش کردیں، خدا کی حکومت خدا کے نیک بندے ہی قائم کر سکتے ہیں اور خدا کے بندوں کو اس کام کا موقع اسی وقت ملے گا۔ جب وہ ظالم و جابر حکمرانوں کو تخت اقتدار سے نیچے اتار لیں گے۔"

میں اور مولانا عبدالقادر آزاد ان کی تقریر کے نوٹس لے رہے تھے، خیال تھا، اصولِ قصۂ زمین برسرِ زمین" کے تحت اس موسیٰ بالعصاء کو آج ہی بتا دیا جائے کہ ایران آنے والے علماء "سیرت کانفرنس" میں شرکت کی غرض سے آئے ہیں ان میں سے کوئی بھی شخص آپ سے تربیت لینے کی پوزیشن میں نہیں۔ ——————— آقائے حسن نے اچانک تقریر ختم کر دی اور اس کے فوراً بعد قاضی اسرار الحق کو اظہار خیال کے لئے کہا گیا، قاضی اسرار نے کسی مثبت یا منفی ردعمل کا اظہار کئے بغیر بڑی خوبصورتی سے طرح دی اور بیٹھ گئے، وہ اگر چہ ہم سے فاصلے پر تھے مگر یہ بات سمجھ گئے کہ رفقاء سے مشورہ کئے بغیر اس مسئلے پر اظہار خیال مناسب نہیں ——— قاضی اسرار الحق کے بیٹھتے ہی ایک ہندوستانی عالم کو دعوتِ سخن دی گئی، ان صاحب نے چھوٹتے ہی بانیان پاکستان سے لیکر حامیان پاکستان تک سب

پر تنقید شروع کر دی، آغازِ گفتگو یوں تھا:۔

"قیامِ پاکستان کے وقت بانیانِ پاکستان نے اسلام کا نام استعمال کیا لیکن جب پاکستان بن گیا تو یہ لوگ اسلامی نظام کے نفاذ کے ضمن میں عوام سے کئے گئے وعدوں سے منحرف ہو گئے۔ آج پاکستان سمیت دنیا کے کسی ملک میں اسلام نظر نہیں آتا، یہ مسلم ممالک سامراج کے آلۂ کار ہیں، صرف ایران ہی ایسا ملک ہے جو مسلمانوں کے خواب کی تعبیر ہے، ایران کے سوا دنیا میں کہیں بھی اسلام کی عملداری نہیں"۔

میں نے آقائے حسن سے کہا، فاضل مقرر کو ہدایت کیجئے کہ وہ پاکستان، بانیانِ پاکستان اور حکومتِ پاکستان کے بارے میں کہے گئے اپنے غیر ذمہ دارانہ الفاظ پہ معافی مانگیں، کیونکہ پاکستان یا کسی بھی دوسرے ملک کے بارے میں گفتگو اس اجلاس کے موضوع میں شامل نہیں، پارا چنار کے ایک طالب علم جو "حوضۂ علمیہ" میں مقیم ہیں، اس وقت ترجمانی کے فرائض انجام دے رہے تھے، وہ مقرر کی وکالت پر اتر آئے، ان کا کہنا تھا کہ مقرر کی کسی بات سے پاکستان کی توہین نہیں ہوئی، ہندی مقرر کو جو ایک حامی نظر آیا تو وہ انتہائی کرخت لہجے میں بولے:۔

"آرام سے بیٹھئے صاحب! پاکستان کا نام تو آئے گا"۔ ——— اب اگرچہ بات ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی مگر ہم نے پھر بھی تحمل سے کام لیتے ہوئے اُن سے استدعا کی کہ موضوع سے ہٹ کر بات نہ کریں اور اب تک جو کچھ کہہ چکے ہیں اس کی معافی مانگیں مگر ہماری ہر خواہش، ہر گزارش، ہر استدعا اور ہر التجا صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ ہمیں یقین ہو گیا، وہ باز نہ آئیں گے، نہ معافی چاہیں گے، تب میں نے با دلِ نخواستہ اعلان کیا کہ اگر صدرِ جلسہ نے مقرر کو ہمارا مطالبہ ماننے پر مجبور نہ کیا تو پاکستانی علماء نہ صرف اس اجلاس سے واک آؤٹ کرینگے، بلکہ کانفرنس کے آئندہ ہونے والے پروگراموں میں بھی شریک نہیں ہوں گے،

اس موقع پر مولانا عبدالقادر آزاد بھی شریک احتجاج ہو گئے، انہوں نے کہا، ہم نے بہت صبر و تحمّل سے کام لیا لیکن معلوم ہوتا ہے، آپ لوگ صبر کے قدر دان نہیں، جبر کے قدر دان ہیں، ہمارے ساتھی نے جو مطالبہ کیا ہے، وہ پورا ہوگا، ورنہ اس ہال میں موجود تمام لوگ ہمارے ساتھ واک آؤٹ کریں گے، ہندی مقرر نے سنی ان سنی کرتے ہوئے دوبارہ بات شروع کی تو ہم نے براہِ راست مخاطب کیا، اب "بلبلِ ہندوستان" جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ صدرِ جلسہ دست بستہ معافی مانگنے لگے، آخر مقرر کو کہنا پڑا کہ اس نے جو الفاظ ادا کئے ہیں، اس سے پاکستان کی توہین مقصود نہیں تھی، ان کی اس بات کو معافی پر ہی محمول کیا گیا، ناگوار بحث خوشگوار ماحول میں ختم ہوگئی۔

ہمیں خوشی کہ ہماری بات مانی گئی، آقائے حسن ابراہیم کو طمانیت کہ ان کی تقریر کے نتیجے میں "موسیٰ بالعصا" پیدا ہو گئے اور ساحرِ ہند کے سانپ کو نگل لیا گیا۔ ہندوستانی علماء کی خوشی دیدنی تھی، جلسہ گاہ سے باہر آکر ایک نوجوان ہندوستانی عالم نے مجھے مبارکباد دیتے ہوئے کہا" میں مولانا شاہ احمد نورانی کا عقیدت مند ہوں، لیکن پاکستان ہم سب کا ہے، سب کے لئے ہے، اس مولوی نے پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کر کے اپنی عزت میں اضافہ نہیں کیا، کمی کی ہے، بہرحال ہم اس سے ہندوستان میں نمٹ لینگے"۔

اس دوران آقائے حسن ابراہیم بھی ادھر آنکلے، انہوں نے ایک بار پھر معذرت کی، پھر دوستانہ انداز میں سوال کیا، آپنے اتنا سخت مؤقف کیوں اختیار کیا؟

ہم نے عرض کیا اپنے لئے نہیں، آپ کیلئے اور آپ کی اسلامی حکومت کیلئے!

وہ حیرت زدہ ہو کر بولے، وہ کیسے؟

ہم نے کہا:۔

ایسے کہ آپ نے پاکستان کے ایک دشمن ملک کے مقرر کو تقریر کا موقع دیا اور اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاکستان کے خلاف زہر اُگلا۔ اس سے لازماً

یہ سمجھا جاتا کہ یہ تقریر آپ کے ایماء پر ہوئی ہے، ہم نے ضروری سمجھا کہ مقرر آپ کی موجودگی میں اپنے الفاظ واپس لے لے" تاکہ آپ کی پوزیشن متاثر نہ ہو اور نہ ہی حکومتِ ایران کا کردار مشکوک ہو! جہاں تک مؤقف کی سختی کا تعلق ہے تو یہ آپ کی تقریر کے عین مطابق تھی، جو شخص "موسیٰ بالعصا" بنے گا اس کا مؤقف بہرحال سخت ہوگا کیونکہ:۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد!

اگلے روز "سیرت کانفرنس" کا آخری اجلاس شروع ہوا تو مقررین کی فہرست سے مولانا آزاد کا نام خارج کر دیا گیا، میرا نام میری غیر حاضری میں پکارا گیا، البتہ قاضی اسرار الحق کو تقریر کا وقت مل گیا، ان کی تقریر ہوئی، پاکستان کی نمائندگی نہ ہوئی، ان کی تقریر میں اظہارِ تشکر تھا، اظہارِ خیال نہیں تھا، اظہارِ تشکر کا موقع گزر چکا تھا اور اظہارِ خیال کا موقع خود ضائع کر دیا۔

وہ ناداں گر گیا سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

کانفرنس کی دوسری نشست میں برطانیہ سے آنے والے بھارتی عالم مولانا قمر الزماں اعظمی نے تقریر کی، ان کی تقریر میں رعد کی گونج، بادل کی گرج، الفاظ کا پھیلاؤ اور دلائل کا بہاؤ تھا، لیکن روانی میں عربوں کا "تصورِ قومیت" بھی ان کی تقریر کی زد میں آ گیا، تقریر کے بعد میں نے ان سے گزارش کی کہ عرب قومیت کا لفظ عجم کے مقابلے میں استعمال نہیں ہوتا، اسرائیل کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے، آپ نے جو بات اخلاص سے کہی، وہ اس مقام پر اخلاص کی حامل نہیں رہی کیونکہ جس سٹیج پر بات ہوئی، اس سٹیج کو آراستہ کرنے والے بیت المقدس کے ساتھ ساتھ بیت اللہ کو بھی "آزاد" کرانے کا عزم رکھتے ہیں، اس مقام پر آپ کی تقریر کا یہ حصہ ان کے ارادوں کی تائید سمجھا جائے گا۔

مولانا اعظمی نے کہا" واقعی بھول ہو گئی، میرا مقصد یہ تھا کہ عرب اور غیر عرب سب

مسلم قومیت رکھتے ہیں، ہمیں مسلم قومیت پر زور دینا چاہیئے تاکہ اُمّت میں اتحاد و یگانگت پیدا ہو، میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ سٹیج آراستہ کرنے والوں کے ارادوں کی تائید کی جائے۔" ایران میں عرب دشمنی انقلاب کا لازمہ سہی مگر عوزستان اور کردستان کی عربی تہذیب ان پر یلغار کئے ہوئے ہے، ان کا رہن سہن، اندازِ نشست و برخاست اور طریق ملاقات مکمل عربی نہیں تو مشابہہ عربی ضرور ہے، وہ عربوں کو کعبے کے انتظام و انصرام سے محروم کرنے کا عزم رکھتے ہیں مگر عربی تہذیب ان کے طرزِ زندگی پہ غالب آرہی ہے، کعبۃ اللہ کو فتح کرنا ایران کا خواب ہے، اور خود ان کے دل و دماغ کا فتح ہو جانا ایک ناقابل تردید حقیقت!

ویسے میرا تأثر یہ ہے کہ ایران کے عوام اور خواص کا اندازِ فکر جُدا ہے، ایران کے عوام کعبے کو خدا کا گھر اور کعبے کے پاسبانوں کو اس گھر کا محافظ سمجھتے ہیں، ایران کے مذہبی مراجع بھی اسی سوچ کے حامل ہیں، ہم نے آیت اللہ شریعت مدار کی بابت یہی سُنا ہے، آیت اللہ شہاب الدین مرعشی نجفی، آیت اللہ گل پائیگانی اور دوسرے مراجع کو بھی معتدل پایا ہے، وہ عربوں کی سیاسی پالیسیوں اور وابستگیوں پر تنقید ضرور کرتے ہیں مگر عربوں کے اسلام پر حرف گیری نہیں کرتے، البتہ امام خمینی اور ان کے رفقاء عرب دشمنی میں بہت آگے جا چکے ہیں، ان کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ کعبے کو فتح کر کے وہاں سے امام خمینی کے "امام مہدی" ہونے کا اعلان کر دیا جائے اور پھر عالم اسلام کے نوّے کروڑ مسلمان امام خمینی کے ہاتھ پر از سر نو اسلام قبول کریں، اس سے قبل وہ کسی کو مسلمان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ایران کی حکمران طاقت کے اندازِ فکر کی یہ جدت اور انقلاب جدید کی یہ پرواز اس راز کو خود ہی فاش کر دیتی ہے کہ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی فقہ کے برعکس ایران میں "ولایت فقیہہ" کے منصب کا قیام کس مقصد کے تحت عمل میں آیا ہے؟ بہرکیف

کعبے کے مالک نے ہر دور میں کعبے کی حفاظت کی ہے۔ اس کے پاس لشکر ابرہہ کے لئے ابابیل کی کیا کمی؟

ہر کجا دردلیست درمانی مقرر کردہ اند

ایران کے ارباب بست وکشاد سے توقع تھی کہ وہ "تحریک اسلامی" کے حوالے سے عالم اسلام کو متحد کرنے کے لئے جدوجہد کریں گے، اب یہ توقع پوری ہوتی نظر نہیں آتی، کسی ایک ملک سے ان کی مخالفت سمجھ آتی ہے، عالم اسلام سے مخالفت سمجھ سے بالا ہے۔ فراست، بصیرت اور حکمت کا تقاضا تھا کہ انقلاب کے بعد مسلم دنیا سے رشتۂ اخوت قائم کیا جاتا، صورت یہ ہے کہ جو رشتہ انقلاب سے پہلے موجود تھا۔ اُسے بھی ختم کیا جارہا ہے، امام خمینی نے اپنی تقریر میں عالم اسلام کے علماء کو جس بات کی تلقین کی، اس کا ذکر گذر چکا ہے، ان کے ایک اور دست راست آیت اللہ آزری قمی کا ارشاد بھی سن لیجئے، ہم قم میں آیت اللہ منتظری کی تقریر کے بعد حضرت آزری کی خدمت میں پہنچائے گئے تو انہوں نے فرمایا:۔

"ایران کے اسلامی انقلاب کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانا آپ کا فرض ہے، آپ ہمارے انقلاب کے لئے وقف ہو جائیں، ہمارے وسائل آپ کے لئے وقف ہوں گے، ہمیں آپ کی مشکلات کا احساس ہے اور ہم ان مشکلات کو رفع کرنے کا بندوبست کر چکے ہیں، ہم نے آپ کے لئے ایک صندوق رکھا ہے، ہر ہفتے ایک روزہ تیل کی آمدن اس صندوق میں جاتی ہے، آپ کی مالی مشکلات اس فنڈ سے بخوبی پوری ہوسکتی ہیں"

آیت اللہ آزری قمی کی یہ تقریر میں خود نہیں سن سکا، واپسی پر مولانا آزاد نے یہ تقریر سنائی تو ہم پر سکتہ طاری ہوگیا، ایسی کھلی باتیں اور ایسی دلفریب گھاتیں؟

ایں کار از تو آید مرداں چنیں کنند

قم جانے سے پہلے ہمیں آیت اللہ منتظری کے ساتھ ملاقات کا مقصد بتایا گیا

وہاں پہنچے تو کئی دوسرے بزرگوں کے پاس بھی لیجایا گیا، ان بزرگوں سے ملاقات یقیناً ہماری سعادت تھی، لیکن ہمارے میزبان ہمیں جس طرح ایک مقام سے دوسرے مقام تک لیجاتے رہے، وہ انداز مہمانوں کے مقام اور میزبانوں کے انتظام سے بے خبری کی دلیل تھا۔

حضرت آیتُ اللہ منتظری کے گھر سے نکلے تو منتظمین نے جلوس کی شکل بنالی، وہ اپنے مہمانوں کو صف بستہ بناکر نعرے لگاتے، گلی کوچوں میں گھوستے، گھماتے اور پھرتے پھراتے دوسرے بزرگ کے گھر تک پہنچے، ہم نے آج تک نہیں سنا کہ کوئی انقلابی یا غیر انقلابی حکومت اپنے مہمانوں کا جلوس نکال کر اپنے شہریوں کے سامنے اپنی قوت کا مظاہرہ کرتی ہے، قُم سے تھک ہار کر رات گئے تہران پہنچے تو وہی ہوٹل، وہی کرنٹ، وہی "ارتھی فضا" اور وہی آب وہوا۔

ایران میں اپنے بیس روزہ قیام کے دوران ہمیں چھ ہوٹلوں میں رہنے کا موقع ملا۔ زاہدان کے سوا ہر شہر کے ہر ہوٹل میں کرنٹ کے جھٹکے کھائے اور ایک عجیب و غریب تماشا بنا رہا ـــــ کسی نے کسی سے ہاتھ ملایا اور الٹ کر رہ گیا، کسی نے دروازہ کھولنا چاہا اور قلابازی کھاتا ہوا دوسری دیوار تک چلا گیا، کسی نے اپنے سامان کو ہاتھ لگایا اور گیند کی طرح فضا میں اُچھل گیا، قدم قدم پہ کرنٹ، روش روش پہ جھٹکے اور نظر نظر میں ہراس ـــــ وجہ پوچھی تو کہا گیا ایران کی فضا 'ارتھی' ہے، یہ ارتھی فضا ہوٹل کے اندر تھی، باہر نہیں!

اس جھٹکا جھٹکی کے آغاز میں ایک ایرانی افسر نے مجھے اچھلتے دیکھ کر بتایا، پہلے دیوار کو ہاتھ لگاؤ، پھر دروازہ کھولو!

نسخہ مجرب تھا، دوستوں کو بتایا تو حیران ہو کر پوچھنے لگے، تمہیں کیسے معلوم ہوا؟ میں نے کہا

این نسخہ از بیاضِ مسیحا نوشتہ ایم

کرنٹ اور جھٹکوں سے بچنے کا نسخہ معلوم ہونے پر خدا کا شکر ادا کیا، ہم کسی چیز کو بھی ہاتھ لگانے سے پہلے دیوار کو ہاتھ لگانا بھول جاتے تو سزا پاتے، "خلا، گھر" میں جاتے تو "آلۂ آب" کو ہاتھ لگانے سے خوف آتا، یہاں عملِ "دست بہ دیوار" بہت جان جوکھوں کا کام تھا، بہر کیف

غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی

واپسی قریب تھی کہ "محاذِ جنگ" پہ جانے کی نوید سنی، مولانا آزاد سے کہا گیا کہ آج اُن کی فلائٹ ہے، وہ محاذ پہ جانے سے رُک گئے اور قاضی اسرارُ الحق بھی اس اُمید پہ ٹھہر گئے کہ شاید انہیں بھی ٹکٹ مل جائے، ہم لوگ محاذ کے سہ روزہ دورے سے واپس آئے تو ہر دو حضرات کو موجود پایا، ان کو ٹکٹ نہیں ملے تھے، تنہائی ملی تھی اور تنہائی کے ساتھ جو اضافی چیز ملی، افسوس کہ ہم اس سے محروم رہ گئے! مولانا آزاد کی روایت ہے کہ اس دوران کچھ "مردانِ بزرگ" تشریف لائے اور اُن سے تبادلۂ خیال کیا۔

ایک آیت اللہ نے کہا۔ آخر آپ میں کس بات کی کمی ہے، آپ عالم ہیں، شاہی مسجد کے خطیب ہیں، عوام میں اثر رسوخ رکھتے ہیں، آپ کے چاہنے والوں کی کثرت ہے!

مولانا آزاد نے کہا، بیشک اللہ کا دیا سب کچھ موجود ہے۔

انہیں مشورہ ملا کہ پھر انقلاب کے ذریعے آپ ملک کے صدر کیوں نہیں بنتے؟

کیا فوج میں آپ کا کوئی رسوخ نہیں؟

مولانا آزاد نے مصنوعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا، میرا تو کوئی "رسوخ" نہیں البتہ قاضی اسرار الحق "فوجی خطیب" کی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں!

ارشاد ہوا ——— !

پھر تو کسی تردد کی ضرورت ہی نہیں، یہ فوج کے ذریعے انقلاب لائیں، یہ ملک کے صدر بنیں اور آپ وزیر خارجہ، انقلاب کے بعد "منصب ولایت فقیہہ" بنائیں، جس کے اختیارات علماء کے پاس ہوں اور کلیدی آسامیوں پر علماء کو مامور کیا جائے" مولانا آزاد نے واپسی پر ہمیں "حکم" دیا کہ قاضی اسرار صاحب کا احترام کیا جائے، کیونکہ انہیں ملک کا "صدر" بنا دیا گیا ہے۔ قاضی صاحب نے فرمایا۔ نظر انتخاب تو ان پر پڑی تھی، لیکن انہوں نے میرا نام پیش کر دیا، اب مولانا آزاد سے کوئی کہے تو اس کے سوا کیا کہے۔

کھو دیئے انکار سے تم نے مقاماتِ بلند
چشم ایراں میں نہیں کوئی تمہاری آبرو

انقلابِ ایران میں دُنیا خیر کے پہلو تلاش کر سکتی ہے، لیکن فرزندانِ انقلاب کے طور طریقے، خفیہ گھاتیں اور کھلی وار داتیں، پوری دنیا سے بغاوت اور پوری دنیا کو انقلاب کی دعوت، ایسی باتیں ہیں جو انقلاب کی مثبت علامتوں کو مٹا دیں گی، امام خمینی اپنے انقلاب کے قیدی ہیں، وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتے، عوام میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، تودہ پارٹی نے شریک اقتدار جماعت ہو کر اسلام کو وحشت کا عنوان اور علماء اسلام کو عوامی نفرت کا نشانہ بنا دیا ہے۔

ان حالات میں ایک ہی شخصیت عوام میں جانے اور انہیں سمجھانے کا حوصلہ رکھتی تھی اور وہ آیت اللہ شریعت مدار تھے، آیت اللہ شریعتمدار کے لاتعداد پیروکار ہیں، امام خمینی کی جلا وطنی کے دوران تحریک کی قیادت ان کے ہاتھ میں تھی، اب امام خمینی کی حکومت میں وہ نظر بند ہیں، خمینی حکومت میں شامل مذہبی عناصر اور سیکولر نظریات کے حامیوں کو ان کی نظر بندی سوٹ کرتی ہے، سوشلسٹ عناصر سمجھتے ہیں کہ اگر آیت اللہ شریعت مدار عوام میں آئے تو ان کی خفیہ سرگرمیاں عوام

کے سامنے بے نقاب ہوجائیں گی، وہ انقلاب کو جس رخ پر لیجانا چاہتے ہیں، اُس رُخ پہ نہیں لیجا سکیں گے، جب کہ امام خمینی کی سوچ قدرے مختلف ہے، امام خمینی انقلاب کی کہانی اپنے ساتھ ختم کرنا چاہتے ہیں، ان کی خواہش ہے کہ جب تک ان کی آنکھ کھلی ہے، انقلاب رہے، انقلابی قوتیں رہیں اور جونہی ان کی آنکھ بند ہو انقلاب کی بساط لپیٹ لی جائے، جو کہانی ان کی ہجرت ایران سے شروع ہوتی ہے، وہ کہانی ان کی رحلتِ جہاں پہ ختم ہوجائے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی نظرِ انتخاب بطور جانشین آیت اللہ منتظری پہ ٹھہری، آیت اللہ شریعت مدار تک نہ جاسکی، آیت اللہ منتظری بہت بڑے فقیہہ ہیں، لیکن سیاستدان ہرگز نہیں، وہ "ولایتِ فقیہہ" کو فقہی مسائل بتا سکتے ہیں" ولایت فقیہہ" کے تحت حکومت نہیں چلاسکتے، اس کے برعکس آیت اللہ شریعتمدار، عالم و فقیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ، بلند پایہ سیاستدان بھی ہیں، عالمی مسائل پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، داخلی و خارجی مسائل و معاملات کو بھی سمجھتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ عالمِ اسلام کے بارے میں اُن کی سیاسی پالیسی اتنی ہی نرم ہے، جتنی موجودہ "ولایت فقیہہ" کی پالیسی سخت ہے، اس قسم کے اہم وجود کو پس منظر میں دھکیلنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور تھا، لیکن انقلابی قوتوں نے اس کا حل بھی ڈھونڈ نکالا، آیت اللہ شریعتمدار کے خلاف کارروائی کا آغاز امام خمینی نے خود کیا، چنانچہ انقلابِ ایران کے مصنف جناب صلاحُ الدین لکھتے ہیں:۔

"آیت اللہ شریعت مداری امام خمینی کے عرصۂ جلا وطنی میں قائد تحریک کا کردار کرتے رہے، ۱۹۶۳ء میں جب شاہ خمینی کو گرفتار کرکے قید میں ڈالنا چاہتا تھا تو انہوں نے ہی علماءِ قم سے یہ فتویٰ جاری کرایا کہ وہ "مرجع" ہیں اور دستور کے تحت کسی مرجع کو نہ گرفتار کیا جاسکتا ہے، نہ قید میں ڈالا جاسکتا ہے"

شاہ بے بس ہو گیا اور خمینی کو جلا وطن کر دیا گیا۔

انقلاب کے بعد بعض پالیسیوں پر اختلاف رائے اُبھرا، نوبت تصادم تک پہنچی، امام خمینی نے شریعت مداری کی سرکوبی کے لئے پاسداران کی قیادت خود کی، شریعتمدار ذاتی طور پر کوئی تصادم نہ چاہتے تھے، ان کے عقیدت مندوں نے بے قابو ہو کر خود ہی احتجاج شروع کر دیا تھا۔ ان پر قابو پانے کے بعد امام خمینی شریعت مداری سے خود ملے، معاملہ رفع دفع ہو گیا، لیکن شریعت مداری پس منظر میں دھکیل دیئے گئے"۔

آیت اللہ شریعتمدار کو پس منظر میں تو دھکیل دیا مگر یہ کوئی پائدار حل نہیں تھا، یہ چنگاری اپنی خاکستر سے اٹھ کر کبھی بھی شعلۂ جوالہ بن سکتی تھی، چنانچہ اس خطرے کو مستقل طور پر رفع کرنے کے لئے "قطب زادہ کیس" کی نیو رکھی گئی۔ قطب زادہ نے گرفتاری کے بعد اپنے مبیّنہ اقبالی بیان میں کہا کہ حکومت کا تختہ الٹنے کیلئے جو سازش تیار کی گئی تھی، اُس میں آیت اللہ شریعتمدار بھی شامل تھے۔

ایران کے سیاسی حلقے کسی ایسی سازش کے وجود کو نہیں مانتے، ان کا کہنا ہے کہ یہ سیاسی ڈرامہ آیت اللہ شریعت مدار کو راستے سے ہٹانے کے لئے رچایا گیا تھا، چونکہ لوگوں کی اکثریت شریعت مدار کی پیرو کار ہے۔ اس لئے یہ ڈرامہ رچانے کے باوجود امام شریعت مدار پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہو سکی، البتہ وزیر خارجہ صادق قطب زادہ اس ڈرامے کی نذر ہو گئے۔ ان حلقوں کے مطابق قطب زادہ کی گرفتاری کے بعد امام خمینی نے اپنے بیٹے احمد خمینی کے ہاتھ قطب زادہ کو پیغام بھیجا کہ وہ پولیس کے سامنے سازش میں ملوث ہونے کا اقرار کر لیں، چونکہ مجھے اس الزام کی صحت پر یقین نہیں اور میں انہیں اپنا بیٹا بھی سمجھتا ہوں، لہٰذا اقرار جرم کے بعد میں ذاتی طور پر اُن کی جاں بخشی کر دوں گا،

قطب زادہ نے احمد خمینی کی طرف سے جاں بخشی کی یقین دہانی پر اقرار جُرم کر لیا اور اسی اقرار جُرم کے نتیجے میں انہیں سزائے موت دی گئی، اسی طرح یہ واقعہ بھی سننے میں آیا کہ ایک کرد لیڈر کو امام خمینی نے قرآن کے حاشیے پر لکھ کر بھیجا کہ وہ ان کے نمائندے کے ہمراہ آکر اُن سے مذاکرات کریں تاکہ معاملات کو سلجھایا جا سکے۔ قرآن کے حاشیے پر یہ پیغام لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں اور اس چیز کی ضمانت یہ حلف ہے جو قرآن کے حاشیے پہ لکھا گیا ہے، لیکن جب وہ کرد لیڈر امام خمینی کی خدمت میں پہنچا تو اُسے جلاد کے حوالے کر دیا گیا۔

قطب زادہ کے بیان کو ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں اچھالنے کے علاوہ مذہبی حلقوں کی طرف سے شریعت مدار کے خلاف کارروائی کے مطالبے بھی کروائے گئے بلکہ قم کے دانشوروں کی طرف سے یہاں تک کہا گیا کہ شریعت مدار سے "آیت اللہ" کا اعزاز واپس لے لیا جائے، اس ملک گیر پروپیگنڈے کے جواب میں امام شریعتمدار نے قوم کے نام ایک مراسلہ جاری کیا مگر ذرائع ابلاغ میں اسے جگہ نہ مل سکی، اس مراسلے کے اہم نکات یہ ہیں :-

"ان دنوں آقا فخر الدین شیرازی، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے ذریعے مجھ پر بہت سے اتہامات لگائے جا رہے ہیں، حال ہی میں قم کے اساتذہ نے آذربائیجان شرقی و غربی کے بعض نا معلوم طلبہ کی طرف سے ایک ہتک آمیز اشتہار بھی جاری کیا ہے، اس اشتہار کو ریڈیو سے بھی نشر کیا گیا۔ ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے۔ جس اشتہار کو اتنی اہمیت سے شائع کیا ہے، اُس پر اُن طلباء کے دستخط تک موجود نہیں جن کے نام سے اسے منسوب کیا گیا ہے۔

اس اشتہار میں اہانت آمیز جملے اور خلافِ واقعہ باتیں درج ہیں جبکہ مجھے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات اور عزت و آبرو کے دفاع کا حق بھی نہیں دیا گیا۔

میں نے ٹیلی ویژن کے نمائندگان سے ان کی خواہش پر جو گفتگو کی اور اپنی صفائی میں جو کچھ کہا، اسے وعدہ کرنے کے باوجود ٹیلی کاسٹ نہ کیا گیا اور اس گفتگو کے صرف تین جملوں کو ٹیلی گرام کی صورت میں امام خمینی کی خدمت میں بھیج دیا' اس تین لفظی ٹیلی گرام کا میں نے جواب دیا، اس جواب کو اخبارات میں چھپنے سے روک دیا گیا' یہ عمل قانونِ مطبوعات کی خلاف ورزی ہے — میں نے اس کی جو نقول احمد خمینی، رئیس جمہوریہ، رئیس شوریٰ اور رئیس وزراکو ارسال کیں، ان کو بھی اخبارات میں چھپنے سے روک دیا گیا۔

مجھ پر جو الزامات عائد کئے جارہے ہیں، میرے لئے ان کا دفاع کرنا اور حقائق کو سامنے لانا ممکن نہیں رہا، اس وقت میرا مکان محاصرے میں ہے اور لوگوں کی آمد و رفت ممنوع ہے، اگر نماز جمعہ کے خطبات اور ذرائع ابلاغ میں میرے خلاف پروپیگنڈہ مہم اسی طرح جاری رہی تو لوگوں میں میرے خلاف اشتعال پیدا ہوگا اس طرح میری اور میرے خاندان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

میں قطب زادہ کے پورے بیان کو جھٹلاتا ہوں، اگر حکومت کردار کشی کی اس مہم کو بند کرنے پر آمادہ نہیں تو اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ ہمیں پاسپورٹ دے دے اور جس ملک میں وہ مصلحت جانے، ہم وہاں جانے کیلئے تیار ہیں، میرے لئے میرا اللہ ہی کافی اور بہتر وکیل ہے۔"

جب تک قطب زادہ کی سزائے موت کے حکم پر عملدرآمد نہیں ہوا، شریعتمدار کے خلاف پروپیگنڈہ مہم جاری رہی اور جب قطب زادہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تو اس کے بعد امام خمینی نے حکم جاری کیا کہ "ذرائع ابلاغ شریعت مدار کے خلاف پروپیگنڈہ روکیں اور ان کی کردار کشی کی مہم فوری طور پر بند کی جائے"

امام خمینی کے اس حکم میں یہ اعلان بھی شامل تھا کہ "شریعت مدار آئندہ بھی اپنے

نام کے ساتھ آیت اللہ لکھ سکیں گے اور دوسرے مذہبی رہنماؤں کی طرح انہیں بھی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔"

انہیں اپنے نام کے ساتھ "آیت اللہ" لکھنے کی اجازت ملی یا نہیں، اسی طرح انہیں دوسرے مذہبی رہنماؤں کی طرح تمام سہولتوں سے نوازا یا نہیں، اتنی بات تو بہرحال ثابت ہے کہ اس حکم کے اجراء تک نہ تو انہیں اپنے نام کے ساتھ اپنا اعزاز لکھنے کا حق تھا اور نہ ہی انہیں وہ سہولتیں میسر تھیں جو تمام مذہبی رہنماؤں کا حق سمجھی جاتی ہیں، اگر انہیں یہ تمام چیزیں حاصل ہوتیں تو اب امام خمینی کو نیا حکم جاری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس قسم کے اقدامات اگرچہ انقلاب کی قوت و ہیبت کا مظہر سمجھے جاتے ہیں، لیکن یہی اقدامات بالآخر انقلاب در انقلاب کا باعث بھی بن جاتے ہیں

ہمنشیں کاٹ ہے آہن کی فقط آہن سے

ایران کے عوام پر اسلامی انقلاب کے اثرات کی بات بھی بڑی شدومد سے کی جاتی ہے اور بعض مبصر کہتے ہیں کہ ایران کا موجودہ معاشرہ فرشتوں کا معاشرہ ہے، ہم ان لوگوں کی تکذیب نہیں کرتے، وہ جو کہتے ہیں وہی درست اور وہی بجا ہے مگر ان لوگوں سے یہ سوال پوچھا سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک معاشرے یا سوسائٹی کی تعریف کیا ہے؟ اگر ایک خاندان یا ایک کنبے کے افراد کو معاشرہ کہتے ہیں تو آپ کا دعوٰی سو فیصد دُرست ہے۔

ایران جانے والے مہمانوں کے سامنے انقلابی بندشوں کے محدود دائرے میں جس معاشرے کی تصویر پیش کی جاتی ہے، وہ بلاشبہ ایک مثالی معاشرہ ہے، جو لوگ اس تصویر کو دیکھ کر تقریر کرتے ہیں، ان کی تکذیب مناسب نہیں لیکن جہاں تک ایران کے عام شہریوں کا تعلق ہے، ایران جانے والے بزرگوں کو ان سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی، ہم نے شہروں اور بازاروں میں جانے کی خواہش کی تو ہمارے معزز میزبانوں نے خدشات و خطرات ظاہر کئے، کہا گیا کہ باہر "منافقین خلق" سے خطرہ

ہے۔ ہم نے پوچھا کہ اگر باہر تمام "منافقین خلق" ہیں تو آپ کا حامی کون ہے، اسلامی انقلاب کے چاہنے والے کہاں ہیں؟ اس سوال کا ہمیں کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا، اس سے ہمیں اندازہ ہوا کہ باہر جانے میں خطرات تو ضرور ہیں مگر یہ خطرات سیاسی ہیں اور سیاسی خطرات کا مشاہدہ ضروری ہے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہم سرکاری انتظامات کو نظر انداز کر کے دو تین بار شہروں اور بازاروں میں نکلے، گھومے، پھرے، شہریوں کو بہت غور سے دیکھا، جانچا، پرکھا، لیکن ہمیں کوئی فرشتہ نظر نہیں آیا، بلکہ ایرانی معاشرے میں دنیا کے دوسرے معاشرے کے لوگوں کی طرح معیاری اور غیر معیاری، ہر قسم کے افراد ملے۔

مشہد شہرِ علم ہے، یہاں کے لوگ علم اور اہل علم کے قدردان ہیں، ان کی دیانت و امانت کی بہت دھوم ہے، ہم نے مشہد کے ایک بازار کی دو دکانوں سے سودا لیا، دونوں جگہ دونوں اشیاء کی قیمت پچاس "تمان" تھی، دونوں دکانداروں نے ہمیں سو تمان لیکر پچاس "تمان" کا سکہ واپس دیا، کمرے میں آکر انکشاف ہوا کہ "شہر ایمان" کے فرشتے ہم جیسے انسانوں کو ہاتھ دکھا گئے ہیں، جو سکے پچاس "تمان" کہہ کر ہمیں دیئے تھے، غور سے دیکھا تو پچاس "ریال" ثابت ہوئے، یعنی دونوں دوکانداروں نے ہمیں پچاس روپے دینے کے بجائے پچاس پیسے پہ ٹرخا دیا تھا، ضروری نہیں کہ شاعر کی بات سچی ہو۔

جس شہر میں لٹ جائے فقیروں کی کمائی

اس شہر کے سلطان سے کچھ بھول ہوئی ہے

بھول سلطانِ شہر سے نہیں، مبصرِ شہر سے ہوئی، مبصر نے کہا یہ شہر فرشتوں کے شہر ہیں، یہ معاشرہ فرشتوں کا معاشرہ ہے، یہ سوسائٹی ایمان والوں کی سوسائٹی ہے۔

ہم نے سنا اور یقین کیا، جب واسطہ پڑا تو معلوم ہوا، دیکھنے اور سننے میں بڑا فرق ہے۔

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا — دل دشمناں ہم نہ کردند تنگ
ترا کہ میسّر شود ایں مقام — کہ با دوستانت خلاف است جنگ

حضرت مخدوم، مرحوم سے ادنیٰ تصرف کے لئے معذرت کے ساتھ -

سنا ہے پیارے خدا کے جو تھے — نہ کرتے تھے وہ دشمنوں کو بھی تنگ
تجھے کیسے حاصل ہوا یہ مقام — کہ ہے دوستوں سے بھی پرخاش جنگ

تہران کے لالہ زار بازار میں بھی علماء کا قافلہ با جماعت گیا، روزنِ دیوار سے جھانکنے والی خواہرانِ ایران نے فریاد و فغاں کرتے ہوئے اسلامی انقلاب کا جو نقشہ دکھایا، اس پہ مولانا عبدالقادر آزاد ہی بہتر طور پر روشنی ڈال سکتے ہیں، ان حضرات کو واپس بھیج کر میں اور صاحبزادہ سعید ایک تہہ خانے میں اتر گئے، تہہ خانے کے سودے میں قیمتِ خانہ بھی شامل دیکھی، ایک اردو دان خاتون ہماری نادانی کے پیشِ نظر چار سو ریال کو چار سو تمان" ثابت کرنے پہ تلی رہی، اسے اصرار تھا کہ سودا ہمشیرِ خورد کے ہاتھ سے لو اور اسی قیمت پہ لو مگر خالی ہاتھ نہ جاؤ!

اس نے خورد پہ زور دیا اور خورد نے ہم پہ زور آزمائی کی، لیکن خرد مندی کا تقاضا تھا کہ چار روپے کو چار سو روپے کے برابر نہ سمجھا جائے، ہم نے تہہ خانے سے واپسی کا راستہ تلاش کیا اور باہر نکل آئے، عقب سے آنے والی آوازیں دور تک سنیں، دیر تک تعاقب کرتی رہیں ــ لالہ زار بازار کی ایک اور دوکان میں داخل ہوئے، دو، دوکاندار تھے، ایک باپ، ایک بیٹا، دونوں خوش اخلاق اور خوش اطوار ــــــ سامان کی قیمتیں مناسب تھیں جو چیز تہہ خانے میں چار سو تمان میں ملتی تھی، وہ یہاں چالیس تمان سے کم قیمت پر دستیاب تھی، شوکیس کے ایک کونے پر بڑی خوبصورت ٹرے نظر آئی، ٹرے کے وسط میں ایک بڑی بوتل اور اس کے ساتھ چار چھوٹے چھوٹے مگ بھی موجود تھے، میں نے صاحبزادہ سعید کو اس کی طرف متوجہ کر کے آنکھوں آنکھوں میں سوال کیا، وہ کہنے لگے بوتل تو شراب

کی ہے، لیکن اس کے اندر کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے، میں نے دوکاندار سے پوچھا یہ کیا ہے؟
اس نے بہت لاپروائی سے جواب دیا" وہسکی"!

اسی اثناء میں ایک شخص دوکان میں داخل ہوا، دوکاندار نے اسے ہنستے ہوئے کہا، اپنے ہموطنوں کی غلط فہمی دور کرو، نووارد کا تعلق پاکستان کے ضلع ساہیوال سے تھا، وہ برسہا برس سے ایران میں کام کر رہا ہے، اس نے بتایا کہ انقلاب کے بعد شراب نوشی میں فرق ضرور آیا ہے، خاتمہ نہیں ہوا، پینے والوں کو ملتی ہے، بنانے والے بناتے اور بیچنے والے بیچتے ہیں، ایران کے اسلامی معاشرے میں دوکاندار نے شراب جس طرح دوکان پہ رکھی ہوئی تھی، ہمارے گناہگار معاشرے میں کوئی شخص اپنے گھر میں بھی اس طرح بوتل رکھنے کا تصور نہیں کر سکتا!

ایرانی معیشت پر ہندو بنئے بتدریج چھا رہے ہیں، انقلابِ اسلامی کے بعد ہندوؤں کو ترجیحی بنیادوں پر کام کرنے کا موقع ملا ہے اور اب کاروبارِ زندگی میں ہندو بھی سرگرم عمل ہیں، اس کے برعکس مسلم ممالک کے لوگوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کیا جاتا، جو لوگ پہلے سے کام کر رہے ہیں، وہ واپسی کے لئے پر تول رہے ہیں، جنگ کی وجہ سے کرنسی کی قیمت گری ہوئی ہے اور اشیاء ضرورت کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔

لوگ لائن میں لگ کر کھڑے ہونے اور منہ مانگی قیمت ادا کر کے اشیاء ضرورت حاصل کرنے پر مجبور ہیں، راشن بندی کے نئے نظام کے تحت "علماء مکتب" رزق رسانی پہ مامور ہیں، علماء و عوام کے درمیان عقیدت کا رشتہ ٹوٹ چکا ہے، دونوں فریق جبر و ضرورت کی ڈوری پکڑے ہوئے ہیں، ایک طرف جبر ہے، دوسری طرف ضرورت، ضرورت جبر کے سامنے جھکی ہوئی ہے اور ضرورتمند جبار کے سامنے سرنگوں ہے۔

آٹا، دال، شکر، گھی، سبزی، بند، ڈبل روٹی، انڈا، گوشت، تیل، صابن، پٹرول، دودھ، غرض ہر ضروری شئے کے حصول کے لئے" ولایتِ فقیہ" کا کارڈ ضروری ہے،

یہ کارڈ شرطِ وفاداری کے تحت جاری کیا جاتا ہے، انسانوں کا رشتۂ حیات اس کارڈ سے منسلک ہو چکا ہے۔

مرکزی بنک کے سابق گورنر علی رضا نوباری نے لندن سے شائع ہونیوالے جریدہ یورومنی (EUROMONEY) کو فروری ۱۹۸۲ء میں جو طویل انٹرویو دیا، اس میں علماء کے کردار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس انٹرویو کے بیشتر حصے "انقلابِ ایران" کے مصنف نے بھی نقل کئے ہیں، ان کے نقل کردہ حصوں میں ایران کے انقلابی علماء کا جو کردار نظر آتا ہے، اس کی ایک جھلک بھی ملاحظہ فرما لیجئے :۔

"نوباری کا الزام ہے کہ علماء کا طبقہ اب کاروبار کو اپنے ہاتھ میں لیتا جا رہا ہے، انہوں نے اپنا علیٰحدہ بنک "اسلامی بنک" کے نام سے قائم کرنے کی کوشش کی، ۲۰ بڑے ناموں میں آیت اللہ بہشتی اور سپریم کورٹ کے موجودہ جج آیت اللہ اردبیلی بھی شامل تھے، انہوں نے آٹھ کروڑ ڈالر کا سرمایہ جمع کیا، بعد ازاں بنک قومی ملکیت میں لے گئے۔ اسلامی بنک کا چارٹر منظور ہو چکا تھا، میں نے انہیں علیٰحدہ بنک قائم کرنے کی اجازت نہیں دی تھی، وہ کہتے تھے کہ دستور کا اطلاق ہم پر نہیں ہوتا، بعد میں انہوں نے "اسلامی معاشیات کی ایرانی تنظیم" کے نام سے اپنا کاروبار شروع کر دیا، جو تجارتی سرمایہ کاری کے ذریعے خوب منافع کما رہی ہے۔"

"نوباری نے ایک چونکا دینے والا واقعہ بھی سنایا، ۱۹۸۰ء میں اسمگلنگ کے الزام میں چار ممتاز تاجر پکڑے گئے، اس جرم کی سزا موت ہے، انہوں نے جاں بخشی کے لئے ۵ لاکھ ڈالر خلخالی کو دیئے، بعد ازاں وہ امام خمینی کے پاس گئے اور بتایا کہ خلخالی کو یہ رقم سہم امام (حصۂ امام) کے طور پر دی ہے، جو امام کو پہنچنی چاہئے، خمینی نے پہلے تو اس کا یقین نہیں کیا، لیکن "تحقیقات" کرائی تو بات درست ثابت ہوئی اور انتہائی غضبناک ہوئے، ان لوگوں نے بتایا کہ بنک میں خلخالی کے تین کروڑ ڈالر جمع ہیں"

نوباری کا کہنا ہے کہ علماء دھڑا دھڑ جائیدادیں خرید رہے ہیں، اس کا ایک طریقہ یہ

ہے کہ وہ امراء کو اپنا مکان عام قیمت سے نصف پر فروخت کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور اسے خود حاصل کر لیتے ہیں۔"

ہم نے مسٹر نوباری کا انٹرویو جناب صلاح الدین کے حوالے سے اس لئے نقل کیا ہے، تاکہ ایک خاص نکتہ واضح کیا جا سکے، پاکستان میں انقلابِ ایران جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے افراد کے حوالے سے متعارف ہوا، اس کی خوبیاں انہی کے ذریعے سامنے آئیں اور ان خوبیوں کو تسلیم کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ ایک دینی تنظیم سے تعلق رکھنے والے افراد نے اس انقلاب کو "اسلامی انقلاب" کہا تھا۔

ان لوگوں نے انقلاب کے اولیں مرحلے میں جو دیکھا، سنا اور محسوس کیا، اسے بیان کر دیا۔ پھر انقلاب کے تین برس بعد جناب صلاح الدین نے بھی اسی انقلاب کے بارے میں اپنے مشاہدات پیش کئے، ان کے مشاہدات ماضی میں ایران جانے والے لوگوں کے محسوسات سے مختلف ہیں، انہوں نے ایران کے "اسلامی انقلاب" کی نفی نہیں کی، لیکن اثبات میں مبالغہ بھی نہیں کیا، یہ ایک مثبت نقطۂ نظر ہے، جب کہ دوسرے افراد کے تبصرے اور تجزیئے مبالغہ آرائی کا شاہکار ہیں، سوال یہ ہے کہ انقلاب کے ابتدائی مرحلے میں صورتِ انقلاب دیکھنے والوں کے جذباتی بیانات کی صحت زیادہ قابلِ اعتبار ہے یا اس شخص کا بیان زیادہ اہم ہے جس نے انقلاب کے تین برس بعد اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیکر اپنی رائے کا اظہار کیا؟ ذاتی طور پر مجھے دوسرا نقطۂ نظر حقیقت سے زیادہ قریب نظر آتا ہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فی الوقت ایران میں انقلاب کا جو نقشہ نظر آ رہا ہے، وہ اس نقشے سے بھی یکسر مختلف ہے جسے جناب صلاح الدین دیکھ کر آئے تھے، گویا ماضی کے سامنے مستقبل شرما رہا ہے، ابتدا وہ تھی، انتہا یہ ہے، جو محفل کبھی بادہ بجام نظر آتی تھی، آج آتش بہ جام نظر آ رہی ہے!

ع ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

ایران کی زمین پر اگرچہ دُور دور تک جبریت کے سائے پھیلے ہوئے ہیں، لیکن ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں جبریت کا گزر نہیں، یہاں مُروّت کے ایاغ اور دلجوئی کے چراغ ہیں، یہاں روشنی اور راحت ہے، صبر و سکون ہے، تسلیوں اور تشفیوں کی زندگی ہے، رحم و کرم کے جلوے اور لطف و عطا کے مظاہرے ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں عراق کے جنگی قیدی رکھے ہوئے ہیں۔

ان جنگی قیدیوں کو بے پایاں مراعات حاصل ہیں، ان کی تربیت پہ خصوصی توجہ دی جاتی ہے، ان کے ذہنوں سے ماضی کی یادوں کو نکالنے اور زمانہ حال کی نئی باتوں کو داخل کرنے کے لئے دن رات محنت جاری ہے، انہیں باور کرایا گیا ہے کہ وہ دوزخ سے نکل کر جنت میں آئے ہیں، ان جنگی قیدیوں کی ذہنی تطہیر کے لئے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئی ہیں، ان ماہرین کی کوششیں بظاہر کامیاب ہیں اور عراق کے جنگی قیدی ایرانی جیل میں اپنی حکومت کے خلاف اور خمینی حکومت کے حق میں ذوق و شوق سے نعرے لگاتے ہیں، نعرے لگانے والوں میں بہت تھوڑے قیدیوں کا انداز مصنوعی ہے، بیشتر قیدیوں کا انداز قُدرتی ہے۔

محاذ جنگ پہ لڑنے والے فوجی جن ہولناک مناظر کو دیکھنے کے عادی، جس طرز کی خطرناک زندگی گزارنے کے خوگر اور جس طرح کے حالات سے دوچار ہونے پر مجبور ہوتے ہیں، ان حالات کے مقابلے میں جیل کی یہ ہنستی مُسکراتی زندگی، اس کا دفاعی حصار اور حصار میں گونجنے والے قہقہوں کی پُرکیف آبشار، اُن کے لئے جنت سے کم نہیں، اس جیل میں انہیں حاصل ہونے والی نوازشیں، عنایتیں، سہولتیں اور مروتیں، ایسی نعمتیں ہیں جو آزادی کی زندگی میں بھی کم کم ہی میسر آتی ہیں۔

ایرانی حکام اپنے مہمانوں کو ان جنگی قیدیوں سے ضرور ملاتے ہیں، یہ قیدی تقریریں بھی کرتے ہیں اور نعرے بھی لگاتے ہیں، مہمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ ایران، دشمن ملک کے

ان قیدیوں کو اسلامی احکامات کے مطابق بہترین سلوک کا مستحق سمجھتا ہے، ان کو وہی مراعات حاصل ہیں جو ایران کی قومی فوج کو حاصل ہیں۔

اس دعوے میں کسی حد تک مبالغہ قلیل سے کام لیا گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ایران، عراق کے جنگی قیدیوں کے معاملے میں بہت فراخ دِل ہے، ان کو ایران کی قومی فوج کے جوانوں سے زیادہ مراعات دے رکھی ہیں، عراق کے یہ قیدی ایران کے حسنِ اخلاق کے دلدادہ ہیں، بلکہ اب تو یہ قیدی اسلامی انقلاب سے متاثر ہو کر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ انہیں عراق کے خلاف لڑنے کے لئے محاذ پر بھیجا جائے۔

ان قیدیوں کو اپنے بیوی بچے بھی یاد آتے ہیں اور یہ اُن سے ملنے کے لئے بیقرار ہیں، تاہم انہیں یقین ہے کہ وہ بہت جلد اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں گے، اس یقین کی وجہ عراق کی اس "جلا وطن حکومت" کا قیام ہے، جو ایران میں قائم ہے، ان قیدیوں کو ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار کر لیا گیا ہے کہ وہ عراق کی موجودہ حکومت سے جنگ کر کے اسے اقتدار سے محروم کریں اور ان کی جگہ خدا کے ان "نیک بندوں" کو تختِ اقتدار پر بٹھایا جائے جو جلا وطن حکومت قائم کئے ہوئے ہیں۔

اگر ایران عراق جنگ بند نہ ہوئی تو عراق کے یہ جنگی قیدی محاذِ جنگ پہ جا کر اپنے ہی ملک اور اپنی فوج کے خلاف ایک انتقامی جنگ لڑنے پر مجبور ہو جائیں گے، کیونکہ اس سے قبل فوجی جوان کے طور پر انہوں نے اس پر مسرت زندگی کا کبھی تصور نہیں کیا تھا، جس کی ایرانی جیل میں اُن کو جھلک دکھائی گئی ہے، انہیں یقین دلایا گیا ہے کہ فوجی زندگی کی اصل حقیقت وہ نہیں جو ماضی میں تم دیکھتے آئے ہو، اس کی اصل حقیقت مستقبل میں تمہارے سامنے آئے گی جب حکومت تمہاری ہو گی۔

خدا کرے کہ ہمارا یہ تجزیہ غلط ہو، لیکن اس کے غلط ہونے پر کوئی قرینہ موجود نہیں، تاہم اگر اس منصوبے پر عمل کیا گیا تو اس کے نتائج خود ایران کے لئے بھی نقصان کا باعث

بنیں گے، اس لئے یہ مثال ایران کے پیش نظر رہے تو اچھا ہے:۔

چاہ مکن بہر کسے اول خودت دوئم کسے

ایران کے بعض حلقوں کو انقلابی حکومت کے انتہا پسندانہ مزاج، منتقمانہ اقدامات، مخصوص طرز کے انتظامات اور آمرانہ رنگ ڈھنگ کے پیچھے روس کا آہنی ہاتھ بھی دکھائی دیتا ہے، یہ حلقے ایران کے اسلامی انقلاب کو برملا روسی انقلاب کہتے اور پاسداران انقلاب کی اٹھان، پرواز، تربیت اور وحشت و دہشت کو "اشبل و زہرات" کے روسی کیمپوں کا کرشمہ قرار دیتے ہیں، یہ لوگ انقلاب کے محسوس مظاہر سے استدلال کرتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ انقلابِ ایران کا اندازِ نظم، طریق ضبط اور طرز رفتار کمیونسٹ انقلاب کے مشابہ ہے، خمینی کے اقوال کی تشہیر، تصویروں کا پھیلاؤ، مخالف قوتوں کا گھیراؤ، کتابوں اور کیسٹوں کی بھرمار اور خود خمینی کا سیاہ وسفید کا مالک ہونا کمیونسٹ انقلاب کی علامت ہے، اس انقلاب کی منصوبہ بندی کمیونسٹ دماغ نے تیار کی ہے، اور اس انقلاب کی گاڑی چلانے میں بھی کمیونسٹ دماغ کارفرما ہے۔

اس دعوے کی دلیل میں کہا جاتا ہے کہ انقلابی حکومت نے روس نواز تودہ پارٹی سے اتحاد کر رکھا ہے، اگر انقلابی حکومت کے روس سے خفیہ رشتے نہیں ہیں تو روس نواز تودہ پارٹی سے اتحاد کرنے اور مخلوط حکومت بنانے کا کیا جواز ہے؟

ہر چند کہ ہم روس اور ایران کے "رشتوں" کی تلاش کے لئے انقلابِ ایران کے ظاہری خط وخال سے استدلال کرنا مناسب نہیں سمجھتے، لیکن تودہ پارٹی سے انقلابی حکومت کا اتحاد ایسی وزنی دلیل ہے، جسے "اتفاقی حادثہ" قرار دیکر نظر انداز کرنا بھی سخت مشکل ہے۔ جو لوگ انقلاب ایران کے ماضی پہ نظر رکھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتے کہ جب شاہ کے خلاف عوامی تحریک زوروں پر تھی اور ایران کے دروازے پہ انقلاب دستک دے رہا تھا، اس وقت روسی افواج ایران کی "رگِ حیات" سے زیادہ قریب تھیں،

چنانچہ تاشقند کے ایک مبصر اور وقائع نگار مسٹر ولیم اے شمٹ اپنی کتاب "یہودی جنگ سے پہلے" میں لکھتے ہیں :-

" ایران میں جب شاہ کے خلاف عوامی تحریک شروع ہوئی تو روس نے ایران سے ملنے والے مسلم علاقوں میں اتنی فوج جمع کر رکھی تھی کہ ان مسلم علاقوں میں مارشل لاء کے نفاذ کا گمان ہوتا تھا۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ انقلابی تحریک کے دوران روسی سفارت کار شاہ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے ہیں اور اس کے خلاف چلنے والی تحریک کو خاموشی سے دیکھ رہے ہیں، حسنین ہیکل کے بقول آخر شاہ تنگ آکر روسی سفیر ولارڈیمیر ونوگرادوف سے خود ہی کہتا ہے :-

" تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو" ——؟

اس سوال کا اُسے کوئی جواب نہیں ملتا، یہاں تک کہ شاہ رات کی تاریکی میں ملک چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور پھر جب امام خمینی ایران میں داخل ہوتے ہیں تو استقبالیہ ہجوم میں لینن اور ٹراٹسکی کی کتابیں، مارکسی تعلیمات کی گائیڈ بکس اور کمیونسٹ لیڈروں کی رنگا رنگ تصویریں تقسیم ہو رہی ہیں، امام خمینی یہ منظر دیکھتے ہیں لیکن اس "سُرخ شاہی" استقبال کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہتے، گویا ان کے نزدیک یہ معمول کی کارروائی ہے۔ پھر جب خمینی صاحب ایران کا انتظام و انصرام سنبھال لیتے ہیں تو ۱۹ نومبر ۱۹۷۹ء کو جناب برژنیف کا یہ انتباہ نشر ہوتا ہے :-

" اگر امریکہ نے ایران میں کوئی مداخلت کی تو روس اس کارروائی کو اپنی سلامتی کے خلاف سمجھے گا"

روس کی جو فوج افغانستان میں موجود ہے اس کا بڑا حصہ آج بھی ایرانی سرحد پہ ڈیرا ڈالے ہوئے ہے، یہ خاموش رابطے، فوجوں کا اجتماع، امام خمینی کا استقبال،

تودہ پارٹی سے ان کا سیاسی اختلاط اور ان کے خلاف متوقع کارروائی کو روس کیطرف سے "اپنی سلامتی" کے خلاف کارروائی قرار دینا، یہ سب باتیں اپنا کچھ نہ کچھ مفہوم تو رکھتی ہیں۔

بے خودی بے سبب نہیں غالب ۔۔۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

دنیا میں آج تک جہاں کہیں اور جب کبھی کسی اسلامی تحریک نے سر اٹھایا، روس نے اس کی حوصلہ شکنی کی، اس کے خلاف محاذ قائم کرائے، اس کے قائدین کا تمسخر اڑایا گیا، انہیں جاہل اور رجعت پسند قرار دیا گیا، لیکن ایران کی مذہبی تحریک کے بارے میں اس کا رویہ حیرت انگیز طور پہ بدل گیا، اس تحریک کی مخالفت کیگئی نہ اس کے خلاف کوئی محاذ قائم کیا۔ اس تحریک کے قائدین کو رجعت پسند کہا گیا، نہ ان کے خلاف روایتی تنگ نظری کا مظاہرہ کیا، اس کے برعکس دُنیا بھر کے کمیونسٹ اور رُوسی فلسفۂ فکر کے پریس اور تنظیموں نے انقلابِ ایران کی بھرپور حمایت کی!

کسی مذہبی تحریک کے بارے میں روس کے رویتے میں اس طرز کی تبدیلی پہلی بار دیکھی گئی، اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی! ایران کے انقلاب پہ دنیا کو اتنی حیرت نہیں ہوئی جتنی روس کے رویتے میں آنے والے اس انقلاب پہ ہوئی ہے، روس کے مزاج میں یہ حیرت انگیز انقلاب کیسے آیا؟ اس سوال کا جواب تاحال کسی نے نہیں دیا، اس سوال کا جواب ہی وہ کلید ہے، جس سے روس اور ایران کے رابطوں کا سراغ مل سکتا ہے۔

مسٹر ولیم اے شمٹ کی جس کتاب کا ہم نے ذکر کیا، وہ ان کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے، یہ کتاب فرانسیسی زبان میں چھپی تھی، شام کے ایک عالم نے اس کا عربی ترجمہ کیا اور پھر فروری ۱۹۸۰ء میں پاکستان کے جریدہ "حکایت" نے اس کے بعض اقتباسات

شائع کیے، اس کتاب کے بعض مندرجات سے مسلم ممالک کے بارے میں روس کی دیرینہ پالیسی کی نقاب کشائی ہوتی ہے، مسٹر ولیم نے اس کتاب میں جو انکشافات کئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ :-

۱۹۱۷ء میں جب کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا تو مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے ۵۶ ہ ارکانِ اسمبلی میں ۵۴۷ ارکان یہودی تھے، کمیونزم کے بانی کارل مارکس، لینن اور سٹالن بھی در پردہ عالمی یہودی تحریک کے ممبر تھے، ان کا مشن یہ تھا کہ اسلامی ممالک میں سُرخ انقلاب برپا کیا جائے، ان ارکان نے اس بات پر اتفاق کیا کہ مکّہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی موجودگی میں کمیونزم کا فروغ محال ہے، چنانچہ اس پروگرام پر عملدآمد کے لئے اسرائیل کا وجود قائم کیا گیا۔ اس کارروائی کا مقصد یہ تھا کہ اسرائیل کے ذریعے عربوں کو کمزور کیا جائے اور اس کمزوری کے بعد روس مکّے اور مدینے کی طرف پیشقدمی کر سکے۔

روس مکّے اور مدینے کی طرف کن راستوں پر پیش قدمی کر سکتا ہے، اس کی نشاندہی کمیونسٹ پارٹی کے ارکان کی اس تجویز سے ہوتی ہے :-

"کمیونزم کو پھیلانے کے لئے ضروری ہے کہ روس ترکی، ایران، افغانستان اور پاکستان میں اپنی فوجیں داخل کر دے"

مطلب یہ ہے ان ممالک پہ قابض ہونے کے بعد مکّے اور مدینے تک پہنچنے کی راہ ہموار ہو سکتی ہے اور کمیونزم کے دنیا بھر میں پھیلانے کے ناممکن عمل کو ممکن بنایا جا سکتا ہے، ولیم اے شمٹ کا کہنا ہے کہ روس نے اپنی توسیع پسندی کے اس پروگرام میں پاکستان کو ۱۹۴۹ء میں شامل کیا، غالباً یہ وہی دور ہے جب "پاک امریکہ دوستی" کا چرچا سننے میں آیا تھا، گویا پاکستان کو امریکہ کے ساتھ دوستی کے جرم میں اس پروگرام میں شامل کیا گیا۔

ہم یہ مشہور قول بارہا پڑھ چکے ہیں کہ روس ایران کے راستے گرم سمندروں

تک پہنچنا چاہتا ہے، ممکن ہے کسی دور میں اس کی یہ خواہش رہی ہو، لیکن یہ نظریہ اب بہت فرسودہ ہو چکا ہے، اس نظریے سے یہ نتیجہ اخذ کرنا عقل و خرد سے عاری ہونے کی دلیل ہے کہ روس محض اس سادہ سی خواہش کے لئے اتنی تگ و دو کر رہا ہے، روس کی اس طویل اور صبر آزما جدوجہد کا مُنتہائے مقصود گرم پانیوں تک رسائی صرف اس صورت میں ثابت ہوتا ہے، اگر اس کی اپنی حدود میں گرم سمندروں کا وجود نہ ہو، لیکن وہ اس نعمت سے یکسر محروم نہیں ہے۔

روس کے توسیع پسندانہ عزائم کا مقصد محض گرم پانیوں تک رسائی نہیں، وہ ان علاقوں کو تاخت و تاراج کرتا ہوا کعبۃ اللہ تک پہنچنا چاہتا ہے، وہ اس مرکز کے لئے بیقرار ہے جس کا نام لبوں پہ آتے ہی مسلمانوں کے دم و دل میں حرارت پیدا ہو جاتی ہے، وہ عظمت و تقدس کی ان علامتوں کو مٹا کر مسلمانوں کے دل سے حرارت اور دم سے جوش نکالنا چاہتا ہے، اسے گمان ہے کہ اگر اس مقصد میں وہ کامیاب ہو گیا تو نوّے کروڑ مسلمان اس کی غلامی میں آجائیں گے۔

روس اپنی اس خواہش کی تکمیل چاہتا ہے، لیکن اس کے راستے میں دو سربفلک پہاڑ حائل ہیں، اس کی فوجیں ان پہاڑوں کو روند کر آگے نہیں بڑھ سکتیں، کوئی تباہ کن ایٹم بم ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور کوئی سی مادی ترقی ان آہنی رکاوٹوں کو عبور کرنے میں مددگار ثابت نہیں ہو سکتی، اس کے سامنے ایک پہاڑ مذہب کا ہے اور دوسرا جمہوریت کا، مذہب کے پیروکار اس کی نظریاتی یلغار کو روکے ہوئے ہیں اور جمہوریت کے پاسدار اس کی آمریت کے خلاف سینہ سپر ہیں، روسی مذہب کے خلاف ایک طویل اور صبر آزما جدوجہد کے بعد بھی نہ تو اپنی حدود سے باہر کسی ملک میں اپنے گمراہ کن نظریات کی فصل اگانے میں کامیاب ہو سکا ہے اور نہ ہی اپنی ملکی حدود میں بسنے والے اہل مذاہب کے سینوں سے مذہب کی تڑپ نکالنے میں کامیاب ہوا ہے، کیونکہ کمیونزم ایک ایسا

زہر ہے جو اپنے پیروکاروں کو تو ہلاک کر سکتا ہے، مگر کسی آسمانی ہدایت پر یقین رکھنے والوں پر مطلقاً اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے تو کمیونزم کے زہریلے اثرات سے یہ بھی تا حال محفوظ ہے، کیونکہ جمہوریت کا دوسرا نام عدل اجتماعی ہے، جو روئے زمین پر سانس لینے والے تمام اہل مذاہب کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ ہر چند کہ موجودہ جمہوریت کی عمارت اپنا شکوہ کھو بیٹھی ہے اور بعض آمر حکمرانوں کی ذہنی بدکاری اور عملی گمراہی نے اسے رسوا کر دیا ہے، تاہم اس کی بنیادیں ہموار اور استوار ہیں۔

کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں جمہوریت "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول پر چل رہی ہے، لیکن مقتدر افراد کی یہ روش جمہوریت کی روح کو ختم کرنے میں ناکام رہی ہے اور کوئی بھی فرد یا جماعت کھلے بندوں اس نظام کے خلاف بغاوت کی جرأت نہیں کر سکتی، جب کبھی اور جہاں کہیں کوئی مسلح یا غیر مسلح آمریت اس پر حملہ آور ہوتی ہے تو جمہور اس کے خلاف سرگرم عمل ہو جاتے ہیں، اگر عوام اس کے خلاف عملی جنگ نہ بھی کر سکیں تو کم از کم صدائے احتجاج ضرور بلند کرتے ہیں، اور اس طرح وہ جمہوریت کے وجود پر حملہ آور قوتوں کی راہ میں ایک دیوار بنے رہتے ہیں۔

روس کا سیاسی نظام دراصل یہودیت کا چربہ ہے اور اس نظام کے علمبردار مذہب کی مخالفت محض اس لئے کرتے ہیں تاکہ خود ان پر یہودیت کے مبلغ بننے کا الزام عائد نہ کیا جا سکے، وہ انکار مذہب کے نام پر یہودی مذہب کی بالادستی کے لئے کوشاں ہیں، ان کی پہلی اور آخری خواہش یہ ہے کہ دنیا کے تمام وسائل حیات پر قبضہ کیا جائے اور دنیا کے تمام انسانوں پر یہودی نظام مسلط کر دیا جائے، اس سلسلے میں روس نے جو جدوجہد کی ہے یا کر رہا ہے اسے طریق کار کے اعتبار سے دو مرحلوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا مرحلہ آغاز کار سے لیکر موجودہ دور تک پھیلا ہوا ہے، اس عرصہ میں اس نے دنیا کے

حکمرانوں اور مذہب سے برگشتہ انسانوں پر محنت کی، حکمرانوں کے سامنے ہٹلر، سولینی جیسے آئیڈیل پیش کر کے انہیں ظالم و جابر بنایا اور ان کے جبر و استبداد کے ذریعے جمہوریت کو فنا کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کی اور دوسری طرف مذہب سے برگشتہ لوگوں کو اپنے زیر اثر لا کر دنیا کے بیشتر ملکوں میں مذہبی انتشار اور سیاسی انارکی پیدا کی گئی، تاکہ مذہب کے ماننے والے مذہب سے متنفر ہو کر کمیونزم کی گود میں پناہ لینے پر مجبور ہو جائیں جو درحقیقت خود بھی ایک مذہب ہے، ایسا مذہب جو اپنے چہرے پر لادینیت کا خول چڑھائے ہوئے ہے۔

حکومتِ برطانیہ نے برصغیر میں اپنے دورِ اقتدار کے دوران روس کے انہی عزائم کے پیش نظر افغانستان کو بفر سٹیٹ بنایا تھا، تاکہ برطانوی جمہوریت اور روسی کمیونزم کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم رہے اور روس کو اس بات کا موقع نہ ملے کہ وہ اس علاقے کو روندتا ہوا آگے بڑھے اور جمہوریت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس خطے سے نکال باہر کرے، مذہب کے حوالے سے تقسیم مملکت کے فلسفے نے بھی اسی سوچ کے تحت جنم لیا، برطانوی حکمران اس حقیقت کو بھانپ چکے تھے کہ روس کی نظریاتی یلغار کا مقابلے کے لئے جمہوریت پسند حلقے ہی کافی نہیں، جب تک مذہبی قوتیں اس کے ساتھ مزاحم نہیں ہوں گی، اس کی پیش قدمی کو روکنا محال ہے، برطانیہ نے افغانستان کو بفر سٹیٹ بناتے وقت اس نکتے کو خاص طور پر پیش نظر رکھا تھا کہ افغانستان مذہب کا اتنا دلدادہ ہے کہ اس مذہبی حصار کو توڑ کر روس کا آگے بڑھنا بہت دشوار ہے، اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ دنیا نے روس کی طرف سے جن خطرات کو آج محسوس کیا ہے، برطانیہ نے آغاز ہی میں انہیں محسوس کر لیا تھا اور اس سے بھی بڑھ کر قائد اعظمؒ اور ان کے رفقاء کی بصیرت قابل داد ہے کہ انہوں نے ایسے نازک وقت میں اہل مذہب کو ان کا دین و ایمان محفوظ کرنے کے لئے آمادہ کیا جب تھوڑی سی کوتاہی بھی انہیں تباہی سے دوچار کر سکتی تھی، جو لوگ مذہب کے نام پر کسی ریاست کے قیام کو ایک انوکھا عمل سمجھتے ہیں،

وہ اس حقیقت کو فراموش کردیتے ہیں کہ اگر قائد اعظم اپنی قوم کا مذہبی تشخص قائم نہ کرتے تو آج اس خطے میں کمیونزم کا دور دورہ ہوتا یا رام راج کی شعبدہ کاریاں نظر آتیں۔ قائد اعظمؒ نے عین ان دنوں مذہب کی بات کی جب جواہر لال نہرو جیسے رہنما کمیونزم کے مبلغ بنے ہوئے تھے، گویا ہندوستان میں ایک طرف تو روس کا فلسفہ انگڑائیاں لے رہا تھا اور دوسری طرف مذہبی اور جمہوری قوتیں قدم جما رہی تھیں، چونکہ ان دوسری دو قوتوں کا عزم و عمل دُرست تھا، اس لئے ان کے حصے میں کامیابی آئی اور آمر قوّتوں کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد اس خطے کی مذہبی قوتیں محکومیت کے دور سے نکل کر تختِ حاکمیت کی مالک بن گیئں اور روس کے لئے اپنے نظریات کا پھیلاؤ نسبتاً مشکل ہوگیا تاہم اس کی کوششوں میں کمی نہیں آئی، وہ افغانستان کے راستے برصغیر، ایران کے راستے خلیج عرب اور ٹرکی کے راستے درہ دانیال پر قبضے کے خواب دیکھتا رہا تاکہ دنیا پر اپنا تسلط قائم کرسکے، اس عرصے میں اس نے کیا کیا حربے استعمال کئے، کیا کیا اقدامات کئے، دنیا اس سے بے خبر نہیں تاہم اسکی یہ کوششیں بارآور نہ ہوسکیں۔

اب روس نے اپنی جد و جہد کے دوسرے مرحلے میں قدم رکھا ہے اور اب اس کی تکنیک پہلے سے مختلف ہے، پہلے مرحلے میں اس نے مذہب سے برگشتہ افراد کو استعمال کیا تھا، اب مذہب کے دلدادہ لوگوں کو استعمال کرنے لگا ہے، مذہبی ریاستوں میں چونکہ مذہب دشمن افراد کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں لاسکے، اس لئے اب ایسے افراد کو وہ آگے لا رہا ہے جو مذہب کے نام پر جیتے اور مذہب کے نام پر مرتے ہیں، جن کا ظاہر ان تمام اوصاف کا حامل ہے جو ایک مذہبی اور دینی شخصیت کا لازمہ ہوتے ہیں، وہ کامریڈ اور موسیو طرز کے لوگوں کے بجائے جبّوں اور عماموں والے "حضرت" اور "مولانا" قسم کے افراد سے کام لے رہا ہے، ایران میں اس نے یہی تکنیک استعمال کی ہے،

اور تودہ پارٹی کے ذریعے جو کام کرنا ممکن نہیں تھا، حزب اللہ اور حزب اسلامی کے ذریعے وہ کام کر لیا گیا ہے، جہاں تک مرگ بر شوروی (روس) کے نعرے کا تعلق ہے تو یہ محض وزن بیت کے طور پر لگایا جاتا ہے ورنہ انتظام و انصرام اور نظام زندگی کا ہر نقشہ وہاں روسی ہے، اسلامی یا جمہوری ہرگز نہیں۔

روس کے پروگرام، عزائم، طریق کار اور جناب خمینی کے کعبۃ اللہ پر قبضے کے خواب کو دیکھیں تو ان کے برپا کردہ انقلاب پر روس کی حوصلہ افزا خاموشی اور روس نژاد تنظیموں کی طرف سے انقلاب ایران کی بھرپور حمایت کا معمہ حل ہو جاتا ہے، اس موقع پر اس نکتے کو بھی ذہن میں تازہ کر لیجیے کہ کعبۃ اللہ کو آزاد کرانے کا خواب صرف وہی ملک دیکھ رہے ہیں جو روس کے زیر اثر ہیں یا وہ ملک جو اسرائیل کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے ہیں، کیونکہ کعبۃ اللہ کی آزادی کا نعرہ لگانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ بیت المقدس سے عالم اسلام کی توجہ ہٹائی جائے اور اسرائیل بیت المقدس کے نقشے میں جو تبدیلی کرنا چاہتا ہے وہ کسی مزاحمت کے بغیر کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی پر قبضے کا پروگرام جناب خمینی کا اپنا پروگرام نہیں، یہ روس کا پروگرام ہے، جناب خمینی کو کعبۃ اللہ میں داخل ہو کر اپنے امام مہدی ہونے کا اعلان کرنے کے لئے رکھا ہے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ مسجد نبوی ... کے وہ جسدِ رسول ﷺ کے دائیں بائیں سونے والے اُن مقدس ...

رسول کریم ﷺ کے جسدِ اطہر کے بعد سد...

روس انقلاب خمینی ...

قبضے کے بعد ...

کے نزدیک ...

مطابقتوں کا سنگم ہے۔

پس جس نے نہیں سنا وہ سن لے، جس نے نہیں سمجھا وہ سمجھ لے اور جس نے نہیں جانا وہ جان لے کہ روس جلد یا بدیر افغانستان کے راستے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دے گا، ترکی کا راستہ مزاحمت کا راستہ ہے، وہ اس راستے کے بجائے امن، سلامتی اور دوستی کا راستہ اختیار کرے گا، وہ راستہ صرف ایران کا راستہ ہے، اس راستے پہ محبت کے پھول ہیں نفرت کے کانٹے نہیں، وہ تجربوں کی باڑھ سے نکل کر عمل کے میدان میں آیا ہے، اس نئے میدان میں اس کی آمد اور نئے راستے پہ اس کی پیشقدمی کسی تعجب کا باعث نہیں ہونی چاہیئے، کیونکہ روس نے تکنیک بدلی ہے، نظریہ نہیں بدلا۔

جہاں تک حکومت ایران کی طرف سے اپنی حلیف جماعت تودہ پارٹی کے خلاف تازہ اقدامات کی بات ہے تو اس پر کسی گہرے غور و خوض کی ضرورت نہیں، یہ سب کچھ روس کے اشارۂ ابرو کا کرشمہ ہے، خمینی کی جماعت اور تودہ پارٹی دونوں شریک اقتدار ہیں، ان شریک اقتدار جماعتوں کی دکھاوے کی جنگ ایران میں روس کو مداخلت کی دعوت ہے، اس دعوت پر روس یقیناً لبیک کہے گا، حالات پہ نظر رکھیے اور وقت کا انتظار کیجئے!!

...ب مذہب کے دلدادہ ...

چونکہ مذہب دشمن افراد کوئی قابل ذکر تبدیلی...

وہ آگے لا رہا ہے جو مذہب کے نام پر جیتے اور مذہب

کا ظاہراً تمام اوصاف کا حامل ہے جو ایک مذہبی اور دینی شخصیت

وہ کامریڈ اور موسیو طرز کے لوگوں کے بجائے جبتوں اور عماموں والے حضرت

قسم کے افراد سے کام لے رہا ہے، ایران میں اس نے یہی تکنیک استعمال د...